احادیث رسول سے عقائد و تاریخ کی اصلاح

عالیجناب حکیم سید علی حیدر زیدی صاحب دام مجدہ

امامیہ مشن - لکھنؤ ۳ (ہندوستان)

سلسلہ اشاعت امامیہ مشن لکھنؤ ۱۵۶ء

احادیث رسولؐ سے
تاریخ و عقائد کی اصلاح

از

عالیجناب حکیم سیّد علی حیدر صاحب زیدی دام مجدہ
سکندر پور۔ ضلع فیض آباد

مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ

قیمت ڈیڑھ روپیہ ۵۰ء

تعارف

اب سے دو سال قبل ہم جناب حکیم صاحب قبلہ مدظلہ کا ایک رسالہ ثانی زہرا جناب زینب سلام اللہ علیہا کے حالات میں "پاسبان شریعت" کے نام سے شایع کر چکے ہیں جو بہت مقبول ہوا۔ امسال ہم موصوف کا ایک دوسرا مقالہ "احادیث رسولؐ سے تاریخ و عقاید کی اصلاح" بصورت رسالہ پیش کر رہے تھے۔

یقین ہے کہ مومنین اس رسالہ کو بھی کثیر سے کثیر تعداد برادران وطن میں تقسیم کر کے عند اللہ و عند الرسولؐ ماجور ہوں گے۔

الداعی الی الخیر
سید ابن حسین نقوی عفی عنہٗ
آنریری سکریٹری امامیہ مشن۔ لکھنؤ ۳

محرم الحرام ۱۳۹۳ھ
فروری ۱۹۷۳ء

۷۸۶

انتساب

اس کتاب کا انتساب اپنے مرحوم والدین سیّد زین العباد صاحب طاب ثراہ اور آمنہ اکبری بی بی کے نام کرتا ہوں جن کی دعاؤں اور نیک خواہشات کی بدولت اس قابل ہو سکا کہ یہ چند سطریں بارگاہِ رسولؐ و اہلبیت رسولؑ میں بطور نذرانۂ عقیدت پیش کر سکوں۔

(حکیم) سیّد علی حیدر زیدی۔ ڈی۔ آئی۔ ایم۔ ایس
سکندر پور فیض آباد۔ یو پی
۱۸ مئی سنہ ۱۹۷۰ء

عرضِ حال

یہ چند سطریں بطور گزارش احوال واقعی کے لکھ رہا ہوں۔ (اسکندرپور) جو میرا وطن بھی ہے اور شاید مدفن بھی یہی ہو) یہاں کی پورے سال کی مجلسیں پڑھنے کی ذمہ داری لوگوں نے میرے اوپر ڈال رکھی ہے۔ اور بارہ تیرہ سال سے میں اس فریضہ کو انجام دے رہا ہوں۔ روزانہ کے سننے والوں کے سامنے کیا پڑھا جائے کہ بیان میں جاذبیت بھی باقی رہے۔ یہ ایک اہم مسئلہ تھا لیکن بارگاہ اہلبیتؑ سے کوئی خالی ہاتھ واپس نہیں ہوتا اس لئے میں کیوں محروم رہتا۔ تھوڑا بہت مطالعہ جس میں صرف اردو کی کتابیں میرے لئے ممکن تھیں، کچھ مجلسوں کے سننے کا فیض جن میں سرکار سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ کی مجلسیں سرفہرست ہیں، تھوڑی بہت دوستوں کی بات چیت

اور وہ بھی۔ برادرم حیدر مہدی صاحب رضوی جیسے دوستوں سے گفتگو کی جن کی ذہانت کا اعتراف ان کے مخالفین تک کو ہے۔ باقی کچھ اپنی دماغی کاوش اور سب پر طرّہ مولاؑ کی دین ہے جن کی مدد سے سکندرپور کی مجلسیں تیار ہوئیں اور ان مجلسوں کے بعد میری پہلی کتاب پاسبان شریعت لکھی جا سکی اور اب یہ دوسری کتاب ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ اس میں غلطیاں بھی ہیں اور علمی مواد کی کمی بھی۔ لیکن میں نے احادیث اور مشہور واقعات کو درایت کی روشنی میں دیکھنے کی ایک کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں، اس کا فیصلہ تو پڑھنے والے ہی کریں گے لیکن مجھے اعتراف حقیقت کے طور پر ان تمام لوگوں کا شکریہ تو ادا کرنا ہی ہے جن سے میں محسوس یا غیر محسوس طور پر متاثر ہوا ہوں۔ ابن حسین صاحب نقوی سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ کی اس سعی مشکور کو جو انھوں نے سرکار سید العلماء کی کتابوں کو شائع

کر کے بہت سے لوگوں کی (جس میں میں خود بھی ہوں) مشکلات کو دور کیا ہے کون بھلا سکتا ہے؟ سرکار سید العلماء نے جو کچھ اس دور کو دیا ہے اسے اس عہد کے لوگ اسی وقت فراموش کر سکتے ہیں جب وہ محسن کش ہو جائیں گے۔ برادرم مصطفےٰ حسین صاحب زیدی جن سے مجھے اپنی ادبی غلطیوں کی اصلاح میں مدد ملی محترم برادر ڈاکٹر ابو الحسن صاحب رضوی (محترمہ بانو سید پوری کے شوہر) اور بھائی حیدر مہدی صاحب رضوی ہلوری جن سے مل کر ذہن کو ایک روشنی ملتی ہے اور سکون بھی۔ یہ سب حضرات میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔

۶۸۶

احادیث رسالتمآبؐ سے بے پرواہی

وفات حضرت ختمی مرتبت سرور عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فوراً بعد مسلمانوں نے امر خلافت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی تاکہ نظم حکومت برقرار رہے اور مسلمان انتشار کا شکار نہ ہوں۔ اس بارے میں یہ اختلاف تو ہے کہ یہ کوشش نیک نیتی سے تھی یا بدنیتی سے لیکن اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہو کہ اصحاب رسولؐ کے اس اقدام سے پوری امت مسلمہ رفتہ رفتہ تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگئی۔ جس کی وجہ سے آج پوری دنیائے اسلام انتشار کا شکار ہے۔ یہ بات پوری ذمہ داری کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر وفات سرور عالمؐ کے بعد حکومت سے زیادہ شریعت کے استحکام پر زور دیا گیا ہوتا تو آج یہ انتشار اور اختلاف اتنی شدت سے اور اس قدر نمایاں نہ ہوتا۔ لیکن جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا اور جس کے لیے ہوا یعنی خلافت اور حکومت۔ وہ خلافت بھی بعد میں صرف یہ کہ اسلام کے دامن کو داغدار بنا گئی بلکہ خود ساختہ خلفاء کی بدکرداری

کی وجہ سے اپنی موت آپ مر گئی اس طرح سے اختلافات تو باقی رہ گئے لیکن ذریعہ اختلاف ختم ہو گیا اب پوری امت مسلمہ کا انحصار حکومت و خلافت پر نہیں ہے (اور نہ یہ امور اصول دین میں ہیں) بلکہ صرف دین و شریعت پر ہے اس لئے تاریخ اسلام کا طالب علم بجا طور پر یہ سوچ سکتا ہے کہ شروع ہی میں اگر دین و شریعت کے استحکام پر زور دیا گیا ہوتا تو آج یہ مسلمان شاید اتنے تباہ نہ ہوتے۔ اور رسولؐ کے بعد تاریخ اسلام اتنی داغدار نہ ہوتی۔ جسے بعد میں ختم ہونا تھا اس کی بقا کی اتنی سعی و کوشش کیوں؟ اور جسے ہمیشہ کے لئے باقی رہنا تھا اس سے اتنی بے پرواہی کیوں؟ یہ دو سوال ہیں جو تاریخ کے پڑھنے والوں کے سامنے ہمیشہ باقی رہیں گے۔ اور اس کا کوئی معقول جواب دینا شاید آسان نہ ہو۔

بعد رسولؐ دین و شریعت کی بقا کا ذریعہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ تھی۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسکے ماسوا اہلبیت رسولؑ بھی ہدایت کا ایک مستحکم ذریعہ تھے لیکن بدقسمتی سے یہ ذریعہ اختلافی بنا دیا گیا۔ بہرحال قرآن و سنت کے بارے میں آج بھی مسلمان بالکل متفق ہے۔ تو جب یہ ذریعہ ہدایت مسلمانوں میں بلا کسی اختلاف کے تسلیم شدہ ہے۔ تو بعد رسولؐ ان ہی دو ذرائع کو کیوں نہ محفوظ کر لیا گیا۔ تاکہ آپس میں کوئی اختلاف نہ ہو سکتا۔ شروع میں تو قرآن کے جمع کرنے پر بھی

اختلاف رہا۔ لیکن جب مسلسل جنگوں میں قاری کثرت سے قتل
ہونے لگے اور یہ خوف محسوس کیا جانے لگا کہ کہیں قرآن ضائع نہ ہوجائے
تو جمع قرآن کی مہم شروع کی گئی اور کسی طرح سے تیسری خلافت میں
یہ کام تکمیل کو پہونچا۔ اگرچہ یہ جمع قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے۔
لیکن پھر بھی قرآن کو تلف ہونے سے بچا لیا گیا۔ حالانکہ اگر قرآن
مطابق تنزیل جمع کیا گیا ہوتا تو آج نہ صرف یہ کہ بہت سی آیات
کے ذریعہ ہمیں اس زمانہ کی تاریخ بھی معلوم ہوتی بلکہ قرآن کے ذریعہ
بہت سی تاریخی غلطیوں کی اصلاح بھی ہوسکتی۔ لیکن افسوس کہ ایسا
نہ ہوسکا۔ حضرت علیؑ کا یہ ارشاد آج بھی موجود ہے کہ میں جانتا ہوں
کہ کون سی آیت کہاں، کب، اور کس کے بارے میں اتری ہے لیکن چونکہ
اہلبیت رسولؐ کو شروع ہی سے نظر انداز کیا جارہا تھا اس لئے جمع
قرآن کی مہم میں ان سے مشورہ نہ لینا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن بعض ایسے
بھی صحابہ تھے جن کی قرآن دانی و قرآن فہمی کے بارے میں احادیث
رسولؐ واضح طور پر بطور سند پائی جاتی تھیں۔ جیسے عبداللہ ابن مسعود
وغیرہ ان لوگوں کو نظر انداز کرکے زید ابن ثابت سے قرآن کو جمع
کرانا سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کے علم قرآن
کے بارے میں احادیث رسولؐ کے واضح اشارے نہیں ملتے ہیں۔ اس
طرح سے احادیث رسولؐ کی اہمیت کو شروع ہی سے نظر انداز کیا
جانے لگا۔ یا کم از کم اس مہم کا آغاز ہوگیا تھا۔ قرآن کو جمع کرلیا گیا
جس کی وجہ سے آج بھی قرآن کے بارے میں کوئی اختلاف مسلمانوں

میں نہیں پایا جاتا۔ بالکل اسی طرح سے اگر حکومت اسلامیہ قرآن کے ساتھ ساتھ سنت رسول ؐ کو بھی محفوظ کر لیتی۔ اور بالکل ابتداء ہی میں ہر طرح سے جانچ پڑتال کر کے صحابہ کی موجودگی میں قول و عمل و تقریر رسول ؐ کو محفوظ کر لیا جاتا تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آج مسلمانوں کی حالت موجودہ زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہوتی۔ حصول خلافت اور اسی کام حکومت کا مقصد اگر اس شکل میں ظاہر ہوتا تو شاید یہ دین کی سب سے بڑی خدمت ہوتی۔

لیکن پوری خلافت راشدہ گزر گئی مگر اکابر صحابہ اور برسر اقتدار افراد میں سے کسی کو بھی سنت رسول ؐ کے تحفظ کا احساس تک نہ ہوا اور نہ اس کے قلمبند کئے جانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ملک پر ملک فتح ہوتے رہے جغرافیائی حدود میں اضافہ ہوتا رہا۔ تنخواہ دار لشکر مقرر کئے گئے۔ بیت المال کی بنا کی گئی۔ اہم ترین شخصیتوں کے وظائف مقرر کئے گئے۔ غرضیکہ حکومت دنیا اور ریاست عظمیٰ کے بارے میں ہر کام کیا گیا لیکن دین کی اہم ترین خدمت یعنی سنت رسول کے تحفظ کے بارے میں سوچا بھی نہ گیا اور اس کی یادداشتیں ماضی بنتی گئیں۔ سنت رسول ؐ کے قلمبند کرنے کا کوئی تذکرہ ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا۔ ہاں یہ ضرور ملتا ہے کہ احادیث رسول ؐ کے پڑھنے اور اس کی تبلیغ پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں اور لوگوں کو حکم عدولی پر سزائیں بھی دی گئیں اور یہ سب کچھ اس دور میں ہوا جسے خلافت راشدہ کا بہترین دور کہا جاتا ہے اور ان شخصیتوں کے

حکم سے ہوا جو بقول مولانا شبلی آسمان اسلام کے مہر و ماہ کا مصداق تھیں۔

سنت رسولؐ کو منضبط نہ کرنے کا ہولناک انجام آج سامنے ہے۔ فقہی مسائل جمہور مسلمین میں امام ابو حنیفہ کے زمانے سے منضبط ہوئے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں عہد رسالت کا ادراک کرنے والے لوگ دنیا سے اٹھ چکے تھے۔ اور اب صرف سنی ہوئی باتوں پر دین کا انحصار تھا۔ جن لوگوں نے عمل رسالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہی لوگ بلا کسی اختلاف کے یہ طے کر سکتے تھے کہ حضور اکرمؐ کس طرح سے وضو فرماتے تھے۔ آیا اس طریقہ سے جیسے شیعہ حضرات وضو کرتے ہیں یا جس طرح سے جمہور مسلمین۔ یہ بات واضح رہے کہ قرآن مجید میں وضو کرنے کی پوری ترکیب موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود امت طریقہ وضو پر متفق نہیں ہے اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن میں جو واضح ہدایات ہیں وہ بھی ہدایت کے لئے کافی نہیں ہیں۔ جہاں ابہام ہے وہاں کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن کی موجودگی میں بھی سنت رسولؐ کی ضرورت ہر حال میں باقی رہے گی۔

حضور اکرمؐ کس طرح سے نماز ادا فرماتے تھے۔ ہاتھ کھول کر یا ہاتھ باندھ کر۔ اور اگر ہاتھ باندھ کر تو پھر ہاتھ کس جگہ رکھتے تھے۔ سوروں کی تلاوت میں بسم اللہ بلند آواز سے کہتے تھے یا نہیں۔ تشہد پڑھتے تھے یا نہیں اور اختتام نماز پر روئے مبارک کو کس طرح گردش دیتے تھے۔

حضور اکرمؐ روزہ کس طرح رکھتے تھے۔ آیا افطار میں عجلت اور سحری میں تاخیر یا اس کے برعکس۔

حضورؐ مناسک حج کس طرح ادا فرماتے تھے۔ امت میں جو حج کے بارے میں جو اختلاف ہے اس میں صحیح کیا ہے۔ یعنی حضورؐ کا طرز عمل کیا تھا۔

متعہ کے بارے میں حضورؐ کا طرز عمل کیا تھا؟

تقیہ کے بارے میں تقریر رسولؐ کیا تھی؟ آیا کسی کے عمل تقیہ کو حضورؐ نے برقرار رکھا تھا یا نہیں۔

یہ اور اسی طرح کے سینکڑوں مسائل ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں امت محمدی میں اختلاف ہے لیکن جن صحابہ کرام نے حضورؐ کے ساتھ وضو فرمایا تھا نمازیں پڑھی تھیں مناسک حج ادا کئے تھے روزے رکھے تھے سفر میں قصر کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ ان صحابہ کو بہرحال یہ تفصیلات یاد بھی رہی ہونگی اگر ان سبھوں نے مل بیٹھ کر نیک نیتی سے ان تمام باتوں کو جو سنت رسولؐ ہیں وہ اغلب یقینی تحریری طور پر محفوظ کر لیا ہوتا تو ان کی یہ خدمت ایران و شام اور روم کی فتح سے زیادہ کار آمد اور مفید ہوتی اور قیام حکومت میں مجبات اور ای عجلت کیا ہے دفن رسولؐ پر ترجیح دی جائے ایک فیصلہ کی غلطی تو ہو سکتی تھی لیکن اس کے مابعد کے اثرات مفید بھی ہو سکتے تھے۔

روم میں آج اسلام کا نام و نشان تک نہیں۔ اسپین میں

مسجد قرطبہ اپنی حالت پر خود گریاں ہے۔ شام میں اسلام کا جو حشر ہوا اس پر نام نہاد مسلمان بھی شرمندہ ہے۔ ایران میں بھی جمہور مسلمین کے نقطۂ نظر سے کوئی اچھا اسلام نہیں ہے۔ ٹرکی میں بھی مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں خلافت سپرد خاک کردی گئی۔ غرضیکہ فتوحات کے عبرتناک نتائج سامنے ہیں اور سنت رسولؐ سے بھی بے پرواہی کر گئے اختلاف امت کا بیج بھی بو دیا گیا جواب پوری طرح بار آور ہو چکا ہے۔ یہ ہے بعد رسولؐ صحابہ کرام کی وہ غلطی جس سے اسلام ہمیشہ متاثر رہے گا اور صحیح اسلام کے راستے سے مسلمان ہمیشہ بھٹکتا رہے گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اگر سب بھول گئے یا عمداً نظرانداز کر گئے تھے تو اہلبیت رسولؐ اور بالخصوص حضرت علیؑ نے اس فریضہ کو کیوں نہ انجام دیا۔ اس کا میرے پاس بالکل سیدھا سا جواب یہ ہے کہ دفن رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ کا ایک ہی اعلان تھا "کہ میں اپنی عبا اپنے دوش پر اس وقت تک نہ ڈالوں گا جب تک قرآن کو جمع نہ کر لوں"۔ استحکام حکومت کے نقارخانہ میں اس مرد حق پرست کی یہ آواز اگرچہ قابل اعتنا نہ سمجھی گئی لیکن تاریخ نے ہم تک اس آواز کو پہونچا دیا ہے۔ چنانچہ حسب اعلان حضرت علیؑ نے قرآن کو مطابق تنزیل جمع بھی کیا اور اسے پیش بھی کر دیا۔ مگر حکومت نے قبول نہ کیا۔ اب مولائے کائناتؑ نے اپنا قرآن اس لئے شائع نہ کیا کہ اس کے شائع کر دینے کے نتیجہ میں عالم اسلام میں قرآن بھی

اختلافی شئے بن جاتا اس لیے انھوں نے اسلام کو دو قرآنوں کی موجودگی کے خطرہ سے بچا لیا۔ اگر موجودہ قرآن مطابق تنزیل ہوتا تو آج قرآن کے ذریعہ سے اس زمانہ کے بہت سے صحیح تاریخی واقعات بھی معلوم ہوسکتے اور بہت سی تاریخی غلطیوں کی اصلاح بھی ہوتی۔ یہی برسراقتدار افراد نے شاید انھیں خطرات کے پیش نظر علیؑ کے پیش کردہ قرآن کو قابل پذیرائی نہ سمجھا۔ اب امیرالمومنین علی ابن ابیطالبؑ احادیث رسولؐ کو کس امید پر یکجا کرکے امت کے سامنے پیش کرتے۔ جب اللہ کا کلام علیؑ کے ذریعہ حکومت نے قبول نہ کیا تو رسولؐ کا کلام علیؑ کے ذریعہ کیسے قبول کیا جاتا جبکہ کلام رسالتؐ کا بیشتر حصہ خود علیؑ اور اہلبیتؑ رسالت کی مدح وثنا کے بارے میں تھا۔ یہ تو گویا خود اپنی کہانی رسولؐ کی زبانی پیش کی جاتی یا گویا بالفاظ دیگر اپنا قصیدہ خود پیش کرنا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ علیؑ خود یہ نہیں کرسکتے تھے۔ جبکہ اتمام حجت کے تمام منازل خود سرور عالمؐ طے فرما چکے تھے۔ پھر ان احادیث رسولؐ کو جو اہلبیتؑ کے بارے میں تھے اگر یہ خود پیش کر دیتے تو ان احادیث کی نوعیت واضح طور پر سیاسی بنا دی جاتی اور وہ خفیہ طاقت جو ان احادیث میں تھی لوگ اس سے واقف ہوجاتے اس لئے اب علیؑ نے سب کچھ مشیت اور قدرت پر چھوڑ دیا اور وہی ہوا، مشیت ایزدی کے تحت ہزارہا مخالفتوں کے باوجود اہلبیتؑ رسولؐ کے فضائل محسوس اور غیر محسوس طور پر جمہور مسلمین کی کتابوں میں درج ہوگئے خدا خود محافظ حقیقی ہے اس نے

ان احادیث کی ہر حال میں حفاظت کی گئی۔ اور میرے خیال میں یہی ایک واضح سبب ان کے احادیث رسولؐ کے نہ جمع کرنے کا موجود ہے۔ حالانکہ اور بھی بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کے پیش کردہ احادیث قابل قبول ہو جاتے تو حکومت پر قائم رہنے کے لئے کیا وجہ باقی رہ جاتی اور ارباب اقتدار کس طرح اپنے عمل کے لئے جواز پیش کرتے۔ اسی لئے سنت رسولؐ سے غفلت اور قرآن بلا مطابق تنزیل جمع کئے جانے کا راز سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے نتائج پوری ملت اسلامیہ کے لئے بڑے ہی اندوہناک ہوئے۔ سنت رسولؐ کا ان لوگوں کی زندگی میں محفوظ نہ کیا جانا جنھوں نے قول رسالتؐ کو اپنے کانوں سے سنا تھا اور عمل رسالتؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مستقبل کے اسلام کے لئے تباہ کن ثابت ہوا جس کے اثرات قیامت تک باقی رہیں گے۔ اسی ایک غفلت یا غلطی سے فائدہ اٹھا کر رسولؐ کا نام لے کر فرضی حدیثیں وضع کی گئیں چنانچہ وضعی احادیث کا انبار لگ گیا۔ شروع میں تو فرضی احادیث کی آمد اکا دکا ہی رہی تھی لیکن بعد میں تو احادیث کی کوئی انتہا نہ رہی۔ حضرت عمر جناب ابوہریرہ کو احادیث کی کثرت بیان پر زدوکوب کرتے تھے۔ ام المومنین حضرت عائشہ بھی انھیں یہ اعتراض کرتی ہیں کہ تم جنگ خیبر کے بعد اسلام لائے پھر تم کس طرح اتنی کثرت سے احادیث کی روایت کرتے ہو۔ جناب فاطمہ زہراؑ جب فدک میں حضرت ابوبکر پر حدیث لانورث کے سلسلہ میں اعتراض

فرماتی ہیں اور یہ کہتی ہیں کہ یہ حدیث اس لئے غلط ہے کہ معارض قرآن ہے۔ غرضیکہ یہ ابتدائی آوازیں تھیں ایسی صورت میں ایسی حکومت کے لئے جو محافظ شرع متین اور حامیٔ دین مبین کہلاتی تھی اور بھی لازم ہو جاتا تھا کہ وہ سنت رسولؐ کو پوری احتیاط کے ساتھ قلمبند کرا لیتی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اور جیسے جیسے عہد رسالت کے لوگ اٹھتے گئے احادیث کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا حدیث بیان کرنے والا نہ رہا۔ حدیث گڑھنے والے بڑھتے گئے اور احادیث کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ جسے بھی اسلام کی تاریخ سے دلچسپی ہوگی وہ اس حقیقت سے باخبر ہوگا کہ بنی امیہ کے عہد اقتدار میں کتنی کثرت سے حکومت کے زیر سایہ اور حکومت کے حکم سے اس وضع احادیث کے جرم عظیم کا ارتکاب کیا گیا۔ امام بخاری نے چار لاکھ حدیثوں میں سے چھ ہزار سے زائد حدیثوں کا انتخاب کیا جسے وہ صحیح بخاری میں درج کرنے کے قابل پا سکے۔ اس کے باوجود صحیح بخاری جیسی کتابوں سے کسی بدنیت کو رنگیلا رسولؐ جیسی کتابوں کے لکھنے میں مدد ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حدیثوں کے وضع کرنے والے غیر مسلم نہ تھے ؎

آنکہ کافر نکنند آنچہ مسلمان کردند

نہ صرف احادیث رسولؐ بلکہ سنت رسولؐ کی اہمیت کو بالکل ابتداء ہی میں یہ کہہ کر کم کر دیا گیا تھا۔ کہ ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے۔ حالانکہ یہ فقرہ خود یہ بتا رہا ہے کہ کہنے والے کے ذہن میں رشد و ہدایت کے لئے قرآن کے سوا کچھ اور ذرائع بھی موجود ہیں جن کو

ہنگامی حالات کا فائدہ اٹھا کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اگر کوئی مجبوری ہوتی تو کافی پر اکتفا کیا جاتا۔ سمجھ میں آنے والی بات بھی لیکن بلا سبب دوسرے ذرائع کو نظر انداز کرنا ان ذرائع کو سبک سمجھنا ہے جس میں خود سنت رسولؐ بھی شامل ہے۔ قرآن کسی حال میں بھی کافی نہیں۔ مثال کے طور پر دن میں پانچ بار پڑھی جانیوالی نماز ہی کی کوئی ترکیب قرآن میں نہیں ہے۔ اس کے لئے بہر حال سنت رسولؐ کا سہارا لینا ضروری ہے۔ وہ لوگ جو بعد رسولؐ معصوم سلسلہ رشد و ہدایت کو نہیں تسلیم کرتے ان کے لئے اور بھی ضروری تھا کہ وہ سنت رسولؐ کا تحفظ قرآن کے ساتھ ساتھ کرتے تاکہ قرآن کے اجمال کو عمل رسولؐ کی تفصیل کی روشنی میں واضح کیا جا سکتا جس پر امت بعد رسولؐ عمل پیرا ہو کر صراط مستقیم پر چل سکتی۔ قرآن رسول کریمؐ کا معجزہ ہے اور معجزہ کی اہمیت ہر حال میں صاحب معجزہ کے بعد ہوگی۔ جناب موسیٰؑ و جناب عیسیٰؑ کے ثبوت نبوت کے معجزات ان کی حیات کے ساتھ ختم ہو گئے لیکن جب تک دوسرا نبی آ کر پہلی شریعت کو منسوخ نہ کر دے پیغمبر کے بعد سابقہ نبی کی شریعت کا نفاذ ہوتا رہے گا۔ حالانکہ اس نبی کا معجزہ اب باقی نہیں ہے جو اس نے ثبوت نبوت میں پیش کیا تھا۔ ایسی صورت میں سابقہ نبی کی شریعت اس کے کردار و عمل کی صورت میں نافذ رہے گی۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والا دین جب آیا تو رسولؐ اپنا معجزہ کتاب کی شکل میں لائے تاکہ دین کے ساتھ کتاب بھی

باقی رہے لیکن جب کتاب کافی ہو اور رسولؐ کا کردار و عمل غیر ضروری سمجھا جائے یہ رسولؐ کے ساتھ ظلم عظیم ہے۔ جبکہ وہ کتاب خود کسی ایک مسئلہ کے بارے میں اپنے کافی ہونے کا اعلان بھی نہ کرتی ہو بلکہ سرکار سید العلماء کے لفظوں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ قرآن اترا ہی اس صفت میں ہے کہ وہ ناکافی ہے۔ لیکن بہرحال اس جملہ سے کہ قرآن ہمارے لئے کافی ہے سنت رسولؐ اور اہلبیت رسولؐ سے بے پرواہی کی داغ بیل پڑ گئی جسے کافی سمجھا گیا اسے جمع کر لیا گیا اور جو غیر ضروری سمجھا گیا اسے نظر انداز کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں لاکھوں فرضی حدیثیں عالم وجود میں آگئیں اور اس طرح سنت رسولؐ کو شہید کیا گیا۔ اور اہلبیت رسولؐ کے ساتھ جو سلوک کئے گئے اس پر انسانیت کی تاریخ ہمیشہ گریاں رہے گی اگر شروع میں جمع قرآن کے ساتھ ساتھ سنت رسولؐ کو قید تحریر میں لایا گیا ہوتا تو آج پوری ملت اسلامیہ ایک ہی طرح سے نماز پڑھتی ہوتی۔ ایک ہی اوقات میں روزے کھولتی ایک ہی طرح سے حج کرتی ہوتی تو ایک ہی فرقہ کے چار چار امام نہ ہوتے بلکہ ایک ہی امام ہوتا اور وہ معصوم امام یعنی خود ذات رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتی۔

غرضیکہ یہ اختلافات جن کی جھلکیاں قدم قدم پر آج غیروں اور اپنوں دونوں کو ششدر و پریشان کرتی ہیں نہ پائی جاتیں اور پوری ملت اسلامیہ اپنے اصول و فروع کے ساتھ ساتھ اپنے عمل

میں بھی یکساں ہوتی۔ میں ان انفرادی کوششوں سے جو جمع حدیث کے سلسلہ میں معاذ بن جبل وغیرہ نے کی ہیں واقف ہوں۔ لیکن میرا اعتراض یہ ہے کہ حکومت ذمہ داران خلافت کو اسے کرنا تھا۔ انفرادی کوششیں ناکامی پر ختم ہوئیں۔

لیکن افسوس کہ ذمہ داران خلافت نے سنت رسولؐ اور اہلبیت رسولؑ سے بے پرواہی برتی جس کی وجہ سے ان دونوں کے ساتھ بدترین سلوک کئے گئے۔ وضعی حدیثوں سے صحیح احادیث رسالت کو مشکوک بنایا گیا اور اہلبیت رسالتؐ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس سے تاریخ اسلام ہمیشہ داغدار رہے گی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا کہ صحیح احادیث کو غلط حدیثوں سے علیحدہ کرکے اصلاح کی کوشش کی جائے قابل ستائش ہیں بخدا کہ وہ علماء جنھوں نے اپنی کاوشوں سے ایک نئے علم کی بنیاد ڈالی اور اس طرح علم رجال کے ذریعہ صحیح احادیث کے انتخاب کی کوشش میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہو سکی۔ پھر بھی احادیث رسولؐ کے بارے میں ہمیشہ اختلافات باقی رہیں گے۔ اور ان اختلافات کے نتیجہ میں امت راہ ہدایت سے بھٹکتی رہے گی۔ اسلام کے علماء نے پہلی صدی ہجری کے بعد اس طرح سے دین کے لیے جو کاوشیں کی ہیں وہ عہد خلافت کے فرائض تھے لیکن خلافت نے اپنے فرائض کا عشر عشیر نہ پورا کیا۔ آج دنیا خلافت سے خالی ہے۔ اکابر صحابہ کی تیار کردہ حکومت کی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے

لیکن دنیا دین سے بہرحال خالی نہیں ہے۔ علماء اسلام کے خدمات باقی ہیں۔ کتاب خدا سنت رسولؐ اور اہلبیتؑ کی بدولت اسلام کی شمع مخالفت کی ہزار ہا آندھیوں کے جھونکوں کے بعد بھی روشن ہے۔ اور انشاء اللہ ہمیشہ روشن رہے گی۔ اب دنیا خود یہ فیصلہ کرے کہ علماء اسلام کے خدمات زیادہ وسیع ہیں یا خلفاء اسلام کے خدمات۔ کس کے خدمات کے بل پر اسلام کی کشتی مخالفت کے طوفانوں میں بھی رواں دواں ہے۔ اگر احادیث رسولؐ نہ ہوتے تو صحیح اسلام کا تصور بھی نہ ہوتا۔ اگر اہلبیت رسولؐ نہ ہوتے تو حقیقی اسلام کو بچایا ہی نہ جا سکتا تھا۔ خلافت کے زینہ سے یزید جیسے لوگ اسلام کے حکمراں بنے۔ اہلبیتؑ کی قربانی کی بدولت کربلا میں حکومت اور شریعت کو علیحدہ کیا جا سکا اور دنیا کو فیصلہ کن انداز میں یہ بتا دیا گیا کہ خلیفہ ہونا اور ہے اور محافظ شریعت ہونا اور بات ہے اس لئے شریعت کو خلافت سے بہرحال الگ ہونا چاہیئے۔ شریعت کو تابع خلافت نہیں ہونا چاہیئے۔ کچھ انسانوں کی مشترکہ کوششیں کسی شخص کو خلیفہ تو بنا سکتی ہیں لیکن اسے فی الوقتی صاحب کردار اور محافظ اسلام نہیں بنا سکتی ہیں۔

علماء اسلام کے خدمات کی بدولت سنت رسولؐ کا تحفظ ہو سکا اور اس طرح احادیث رسولؐ کے ذریعہ اہلبیت رسولؐ کے معارف بھی سامنے آئے قول رسولؐ اور عمل اہلبیتؑ کی روشنی میں

اسلام کے حقائق نمایاں ہوئے جس کی بدولت اصول اور فروع اسلام کا تحفظ ہو سکا اور صحیح عقائد اسلامی کو سمجھا جا سکا۔ اب اس پس منظر میں کیوں نہ احادیث رسولؐ کے ذریعہ اس عہد کی صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے اور صحیح اسلامی عقائد کو کیوں نہ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ میرا زیر نظر مقالہ اسی نقطہ کے پیش نظر ہے۔ میں نے خلوص دل سے صحیح احادیث رسولؐ کی روشنی میں تاریخ اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ تاریخ غلط ہو سکتی ہے اگر وہ صحیح احادیث کے معارض ہو۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ بعض احادیث سے نہ صرف یہ کہ عہد رسالتؐ کی تاریخ بھی معلوم ہوتی ہے بلکہ بہت سی تاریخی غلطیوں کی اصلاح بھی ممکن ہے۔ اس طرح بہت سے وہ غلط نظریات اور عقائد جو مسلمانوں میں رائج ہیں صحیح احادیث کی روشنی میں انھیں بھی درست کیا جا سکتا ہے۔

ہادی عالمؐ کے احادیث پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو احادیث کا بیشتر ذخیرہ اہلبیتؑ کے بارے میں ملے گا۔ بنی امیہ و بنی عباس کی انتہائی کوششوں کے باوجود فضائل اہلبیتؑ کو مٹایا نہ جا سکا۔ جو احادیث اہلبیتؑ کی شان میں ہیں ان کا ظاہری رخ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سرور عالمؐ اپنے اہلبیتؑ سے اظہار محبت فرما رہے ہیں۔ کسی حدیث میں اپنے تعلق کا اظہار کیا گیا ہے۔ کسی حدیث میں اپنا رشتہ بیان کیا گیا ہے۔ کسی حدیث میں کسی کی کوئی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ کسی حدیث میں اپنے روح و جسم کی انتہائی قربت کا

اظہار کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مثال کے طور پر کچھ احادیث اس طرح کے ہیں۔

حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ حسینؑ کا خون میرا خون حسینؑ کا گوشت میرا گوشت ہے۔ علیؑ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔

سیدہؑ میرا ایک جزو ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔

ان تمام احادیث میں اپنا رشتہ اپنے جسم و اپنی روح کا تعلق اپنی بے پناہ محبت کا بظاہر اظہار مقصود ہے۔

حسنؑ و حسینؑ جوانان اہل جنت کے سردار ہیں۔ یہ شاہزادوں کی خصوصی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ علیؑ حق کے ساتھ اور حق علیؑ کے ساتھ۔ اس میں علیؑ اور حق کا ایک دوسرے سے تعلق بیان کیا گیا ہے۔

مسلمان ہم اہلبیتؑ میں سے ہیں اس میں ایک صحابی کی عظمت کا اظہار ہے اور اس طرح کی بہت سی حدیثیں ہیں جن میں اپنے تعلقات بیان کئے گئے ہیں لیکن اگر غور سے ان احادیث کا جائزہ لیا جائے تو بات کچھ اس سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر رسولؐ اپنے بچوں کا یا اپنے بھائی کا تعارف کرا رہے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرور عالمؐ اسلام کے رہنماؤں کا تعارف کرا رہے تھے۔ ان احادیث میں مستقبل کی تاریخ بھی ہے۔ تاریخی غلطیوں کی اصلاح بھی ان

احادیث کے ذریعہ کی جا رہی ہے۔ بشرطیکہ ہم نیک نیتی سے حقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ "اعطیت جوامع الکلم" یعنی مجھے جوامع کلمات کی خصوصیت عطا کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بات بظاہر ایک ہی ہو لیکن اس کے بہت سے رخ ہیں اور ہر ایک حق ہے یہ خصوصیت احادیث رسالت میں بے حد نمایاں ہے۔ جس صحیح حدیث کو آپ چاہیے اسی خصوصیت پر پرکھ لیجئے۔ میں نے بھی کچھ حدیثوں کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے تو مجھے عجیب سی روشنی ملی ہے۔ جس سے مجھے اپنے یقین کو اطمینان قلب میں بدلنے کا موقع ملا ہے انھیں خیالات کو میں اس کتاب میں پیش کر رہا ہوں۔ اگر کسی ایک آدمی کو بھی اس کے پڑھنے کے بعد حقائق کے سمجھنے میں مدد ملی تو میں اپنے کو کامیاب سمجھوں گا اور یہ اطمینان ہو جائے گا کہ مجھے اپنی کاوشوں کا صلہ مل گیا۔

احادیث سے تاریخ کی اصلاح

پہلی حدیث

(۱) ارشاد حضرت سرور عالم کہ "سیدہ میرا جزء حصہ ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی"۔ صحیح بخاری نے اس حدیث کو یہیں تک لکھا ہے۔ دوسرے کتب احادیث میں اس کے بعد یہ بھی ہے کہ "جس نے مجھے اذیت دی اس نے اللہ کو اذیت دی اور جس نے اللہ کو اذیت دی وہ کافر ہو گیا"۔ امام بخاری نے ان ٹکڑوں کو

نہیں درج فرمایا ہے لیکن اس سے اصل حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ اس لئے کہ بعد کے فقرات نتیجۂ عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ حدیث کی جان تو پہلا ہی حصہ ہے جسے میں نے اوپر درج کیا ہے۔ اور جیسے امام بخاری نے صحیح بخاری میں درج فرمایا ہے "سیدہؑ میرا جز ء حصہ ہے جس نے اسے اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی"

اس حدیث کے نتیجہ میں بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں جس پر غور کرنا ضروری ہے۔

بجناب سیدہؑ کا نام لے کر ہادی عالمؐ نے کئی اور حدیثیں ارشاد فرمائی ہیں جو بہت مشہور ہیں۔ "اگر میری بیٹی سیدہؑ بھی چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں گا" دوسری حدیث "سیدہؑ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں" تیسری حدیث "سیدہؑ دنیا کی عورتوں کی سردار ہیں" اور بھی حدیثیں ہو سکتی ہوں جو مجھے نہ معلوم ہوں۔

ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول خدا صاحب خلق عظیم پیغمبر تھے انک لعلی خلق العظیم۔ ارشاد حضرت احدیت ہے۔ آپ کے اخلاق حسنہ سے نہ صرف اپنے کو بلکہ غیروں کو بھی فیض پہونچتا رہتا۔ حد یہ ہی کہ جان کے دشمن افراد بھی آپ کے اخلاق کے معترف تھے۔ صحابہ کے بارے میں آپ کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ صحابہ رات کو دیر تک خدمت رسالت میں گفتگو کرتے رہتے یہاں تک کہ حضورؐ کے لئے نماز شب ادا کرنے کا وقت آجاتا اور اس طرح آپ کو تمام رات بیداری ہی کے عالم میں گزارنا پڑتی۔ حضور نہ جانے کتنے دنوں تک یہ تکلیف برداشت

کرتے رہے لیکن اپنی زبان سے کچھ نہ فرمایا یہاں تک کہ بذریعہ وحی خالق نے صحابہ کی اس طویل نشست کا سدباب کیا تاکہ آپ کو آرام کا موقع ملے۔ اسی طرح با آواز بلند گفتگو پر بھی آپ نے صحابہ کو منع کیا۔ بذریعہ وحی اس پر بھی پابندی عائد کی گئی۔ یہ روزانہ کی زندگی کے ایسے واقعات ہیں جو آپ کی طبع نازک پر بار رہا کرتے تھے لیکن آپ نے ازراہ اخلاق اپنی زبان سے کچھ نہ فرمایا۔ نصاریٰ بنی نجران کے لئے مسجد کے کچے فرش پر آپ نے اپنی عبا کا فرش بچھا دیا۔ وغیرہ وغیرہ ایسی بہت سی مثالیں ہیں۔ اخلاق حسنہ کی اس تمہید کے بعد اولاد کے بارے میں آپ کے اخلاق کا سادی طور پر مظاہرہ نہ ہونا حیرت انگیز بات ہے۔ عام تاریخ نے سرور عالمؐ کی تین لڑکیاں پیش کی ہیں جو سب کی سب ام المومنین حضرت خدیجہؑ کے بطن سے بتائی گئی ہیں۔ ایک ہی ماں باپ کی اولاد اور ایک ہی آغوش تربیت ایک ہی مرکز محبت غرضیکہ سب کچھ ایک۔ لیکن رسول اکرمؐ جناب سیدہؑ کے بارے میں نام لیکر بار بار احادیث ارشاد فرماتے ہیں باقی دونوں بیٹیوں کو نظر انداز فرماتے ہیں۔ یہ دونوں بیٹیاں بعد میں حضرت عثمان جیسی شخصیت کے ساتھ یکے بعد دیگرے بیاہی بھی گئیں جو اسلام کے تیسرے خلیفہ بھی ہیں۔ اور جمہور مسلمین کے نزدیک ایک عظیم المرتبت شخصیت بھی۔ اگر فضیلت باعتبار خلافت صحیح سمجھی جائے تو ان کو حضرت رسالت مآب صلعم سے افضل بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر ان سب کے باوجود زبان رسالت اپنی ان دونوں بیٹیوں کے بارے میں خاموش ہے۔ تعظیم کے لئے اگر

رسولؐ اٹھتے ہیں تو صرف جنابِ سیدہؑ کی۔ سرورِ عالمؐ نے کبھی کسی کی تعظیم
نہ کی۔ نہ مردوں میں کسی کی نہ عورتوں میں کسی کی۔ لیکن یہ شرف صرف
جنابِ سیدہؑ کو حاصل ہے۔ مدینہ منورہ میں کہیں سے اگر آئے تو پہلے
جنابِ سیدہؑ کے گھر تشریف لے گئے۔ اگر کہیں جانے لگے تو آخر میں جس
گھر سے رخصت ہوئے وہ گھر جنابِ سیدہؑ کا تھا۔ کبھی دروازہ پر جا کر
اگر سلام کیا تو وہ دروازہ جنابِ سیدہؑ کا تھا۔ یہ معمولِ حیات بغیر کسی
استثناء کے اگر ہے تو صرف جنابِ سیدہؑ کے لئے۔ اسی مدینہ میں حضرت
عثمان کا گھر بھی ہے۔ اسی گھر میں سیدہؑ کی ایک بہن بھی ہے جس سلوک
کے یہ مظاہرے اس کے لئے کہیں نہیں ہیں۔ نہ تو اس کے دروازہ پر جا کر
رسولؐ کے سلام کی آواز سنائی دیتی ہے۔ نہ اس بیٹی کے لیے ایک بار
بھی رسولؐ تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں نہ اس بیٹی کے بارے میں
احادیثِ رسالتؐ سنائی دیتی ہیں۔ نہ تو مدینہ سے جاتے ہوئے
سب سے آخر میں اس بیٹی کے گھر سے رخصت ہوتے ہیں اور نہ واپسی پر پہلے
اس کے گھر پر تشریف لاتے ہیں۔ اسی بیٹی کا شوہر وہ ہے جو انہی نسبت
کے شرف سے ذوالنورین کا لقب بھی پاتا ہے ظاہر ہو کہ اگر یہ دونوں
خواتین حضرت عثمان سے منسوب نہ ہوئی ہوتیں تو انھیں یہ خطاب نہ ملتا۔
یہ اور بات ہے کہ پہلے کفار سے بھی یہ صاحبزادیاں منسوب ہو چکی
تھیں۔ خیر اس سے اس وقت بحث کا محل نہیں ہے۔ لیکن بنیادی
سوال صرف یہ ہے کہ ایک ہی رشتہ ایک ہی ماحول ایک ہی صلب
ایک ہی بطن اور یکساں تربیت کے باوجود پیغمبرؐ کا عمل کتنا مختلف ہے۔

ہر وہ شخص جسے پیغمبرؐ کی سیرت سے دلچسپی ہو سکتی ہے اس کے لئے پیغمبرؐ کی سیرت کا یہ تضاد حیرت انگیز ہے کہا جا سکتا ہے اور یہ کہنا حق بجانب بھی ہے کہ جناب سیدہؑ شرف میں بہرحال سب سے افضل ہیں اور دنیا کی کوئی خاتون مقام شرف میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لئے وہ اپنی بہنوں سے بھی افضل ہیں اس لئے احادیث میں ان کا تذکرہ ان کے خصوصی شرف کی بنا پر ہے۔ یہ جواب یقیناً بہت وزن رکھتا ہے لیکن اس جواب کے نتیجہ میں دو سوال پھر خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ اگر احادیث رسالتؐ جو جناب سیدہؑ کے بارے میں ہیں بربنائے شرف و فضیلت ہیں تو عمل رسالتؐ کس بنا پر ہے۔ یعنی تعظیم کرنا۔ باہر سے آنے کے بعد سب سے پہلے جناب سیدہؑ سے ملنا اور مدینہ سے جاتے ہوئے سب سے آخر میں جناب سیدہؑ سے رخصت ہونا یہ سب کس بنا پر ہے یہ بشریت کے تقاضے ہیں یا رسالت کے۔ اگر بشریت کے تقاضے ہیں تو دوسری بیٹیوں کے لئے کیوں نہیں؟ کیا معاذ اللہ اس سے اخلاق پیغمبرؐ پر حرف نہیں آتا۔ اور اگر یہ سب بربنائے رسالت ہے تو پھر اولاد کیسی ہی کیوں نہ ہو، شرف اور فضیلت اصل چیز ہے۔ ہم کسی کی تعظیم بربنائے شرف کرتے ہیں صرف بربنائے نسبت نہیں کرتے۔ ورنہ جناب آدمؑ و نوحؑ و یعقوبؑ کی ہر اولاد کی بلا کسی استثنا کے تعظیم کرتے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احادیث رسالتؐ یقیناً جناب سیدہؑ کے لیے بربنائے شرف ہیں لیکن وہ حدیث جس میں سرور عالمؐ نے

یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "میری بیٹی سیدہؑ بھی اگر چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالنے کا حکم دوں گا" اس حدیث میں ظاہر ہے کہ جناب سیدہؑ کے لئے کسی شرف کا اظہار نہیں ہے۔ بلکہ فقہ اسلامی کے ایک حکم کے نفاذ کے سلسلہ میں عمل رسالت کی سختی کا اظہار ہے جس میں اپنے سے قریب ترین ہستی تک کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ ہر وہ شخص جسے جناب سیدہؑ سے محبت اور عقیدت ہے اس کا جی یہی چاہتا ہے کہ اس جگہ اگر ان کا نام نہ ہوتا تو بہتر ہوتا۔ تو خود رسول اکرمؐ جنھیں جناب سیدہؑ سے بے پناہ محبت بھی تھی۔ جو اپنی اس بیٹی کو جنت کی عورتوں کی سردار بتا چکے تھے وہ کیوں چوری کی حد جاری کرنے میں بطور مثال ہی اپنی اس باشرف بیٹی کا نام لے رہے ہیں۔ سرور عالمؐ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ میری بیٹیاں جنت کی عورتوں کی سردار ہیں یا یہ نہیں ارشاد فرما سکتے تھے کہ میری بیٹیاں دنیا کی عورتوں کی سردار ہیں۔ یہ تو ضرور ارشاد فرما سکتے تھے کہ میری بیٹیوں میں سے بھی اگر کوئی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ کٹوا دوں گا۔ یا حضورؐ یہ بھی ارشاد فرما سکتے تھے کہ میری بیٹیاں میرا جزو ہیں جس نے ان کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔ لیکن اس عام موقع پر بھی رسول اکرمؐ نے اپنی دوسری لڑکیوں کا تذکرہ نہ فرمایا۔ میرے عزیز دوست حیدر مہدی صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج المورہ کے بقول محاذ اسٹریا تو سرور عالمؐ اچھے باپ نہ تھے یا سیدہؑ اچھی بیٹی نہ تھیں۔ اس پورے پس منظر میں اب تاریخ کے

طالب علم کے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ رسولؐ کی تین بیٹیاں ہیں اور رسولؐ صرف ایک کا ذکر بار بار فرماتے ہیں۔ خواہ یہ تذکرہ مقامِ شرف میں ہو خواہ اس سے ہٹ کر ہو۔ اس لئے مذکورہ بالا احادیث رسالتؐ کی روشنی میں حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۔ بار بار جناب سیدہؑ کا ذکر کرنا اور کسی بیٹی کا ذکر نہ کرنا یہ صاف بتاتا ہے کہ اگرچہ تاریخ میں رسول اللہؐ کی تین لڑکیاں ظاہر کی گئی ہیں لیکن رسولؐ کا عمل رسولؐ کی محبت پدری، اخلاق رسالت، شفقت نبوتؐ غرضیکہ جملہ مراسم نبوی اس روایت کی تردید کرتے ہیں تاریخ کسی سیاسی بنیاد پر رسولؐ کی لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ تو کرسکتی تھی لیکن ان کو رسولؐ کی شفقت نہیں دے سکتی تھی رسولؐ کی محبت نہیں ودیعت کرسکتی تھی جو معیار رسالت کے شایان شان ہوتا اور جس کے نتیجہ میں رسولؐ کی محبت کے وہ مظاہرے ہوتے جو جناب سیدہؑ کے ساتھ تاریخ میں مخصوص ہیں۔ اسی لئے زبان رسالتؐ ہر ایسے شرف کے بارے میں جس کا دین سے تعلق تھا صرف جناب فاطمہ زہراؑ کے بارے میں ادا ہوتی تھی۔ یہ حدیثیں بہرحال صحیح ہیں۔ اور رسولؐ کا عمل ان احادیث کے بالکل مطابق بھی ہے۔ اس لئے ان کی صحت اور بھی مسلم ہے۔ رسول اکرمؐ کے جناب سیدہؑ کے سوا دو بیٹیاں اور بھی تھیں عمل رسولؐ اس کی مطابقت نہیں کرتا۔ اگر دو بیٹیوں کی روایت کو صحیح مان لیا جائے، تو اس سے عدل پیغمبرؐ پر حرف آتا ہے۔ عام حالات میں ایک اچھے باپ کا جو سلوک یکساں طور پر

اپنی تمام اولاد کے ساتھ ہونا چاہیئے رسولؐ کا وہ سلوک جناب سیدہؑ جیسا وجناب زینب وجناب رقیہ کے ساتھ یکساں نہیں ہے۔ حالانکہ کہا یہی جاتا ہے کہ یہ دونوں بیٹیاں بھی اسی محسنہ اسلام کے بطن سے تھیں جس نے رسولؐ کی رفاقت میں اپنی کثیر دولت اور عمر عزیز سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ یہ بھی نہ تھا کہ رسولؐ اکرم زندگی کے کسی لمحہ میں جناب خدیجہؑ کو بھول گئے ہوں۔ کاشانہ نبوت میں ہر عمر اور ہر صورت وشکل کی خواتین آتی رہیں لیکن رسول اللہؐ کے دل میں جناب خدیجہؑ کا جو مقام مرنے کے بعد بھی باقی رہا وہ کسی بیوی کا انکی زندگی میں بھی نہ ہو سکا۔ جب بھی ذکر آیا آنکھوں میں آنسو ذکر کے ساتھ آئے ان کے جیسی کسی کی آواز سنی تو بےچین ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ثروت و شکل عہدہ و منزلت اور عمر غرضیکہ ہر چیز کو نظر انداز کر کے ایک عمر رسیدہ عورت کو تا حیات یاد کرتے رہنا اور انکے تذکرے پر ہر بار آنکھوں میں آنسو آجانا خود یہ بتاتا ہے کہ قلب رسولؐ ہر حال میں ہر دور میں قلب رسالت ہی تھا قلب مجازانہ تھا۔ بشریت کے عام تقاضوں سے یہ دل کبھی متاثر نہ ہوتا تھا۔ وقت کا مرہم رسول اللہؐ کے دل سے جناب خدیجہؑ کی جدائی کے زخم کو کبھی نہ مندمل کر سکا پھر کیسے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ انھیں کی دو لڑکیوں کے ساتھ رسولؐ کا سلوک کچھ ہے اور ایک لڑکی کے ساتھ رسولؐ کا سلوک کچھ ہے جس امتیازی سلوک پر ان لڑکیوں میں سے کبھی کسی نے کوئی شکایت نہ کی۔ ایک شاہزادی جنگ بدر کے بعد وفات

ہو جاتی ہیں لیکن دوسری صاحبزادی تو جناب عثمان کے ساتھ برابر رہیں۔ وہ جن حالات میں مکہ سے تشریف لائی ہیں۔ ان کے کافر شوہر نے ان کو جو اذیتیں پہونچائی تھیں اس کے بعد وہ مزید کرم کی مستحق تھیں۔ رسولؐ نے اپنی رحمتوں کی بارش ان کے ساتھ کی لیکن ان کو وہ درجہ نہیں دیا جو جناب سیدہؑ کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا میں یہ تسلیم کر سکتا ہوں کہ جناب سیدہؑ بضعۃ منّی کی اہل ہیں اور دوسری لڑکیاں اس کی اہل نہ تھیں لیکن اذیت کا مسئلہ تو ایسا تھا جو جسم کے لئے مخصوص ہے اور ان کا احساس بشریت کے عام تقاضوں سے متعلق ہے۔ کم از کم ان بیٹیوں کی اذیت کو اپنی اذیت قرار دیا جا سکتا تھا۔ عوام میں بضعۃ منّی کا بھی عام مفہوم جسم ہی سے مخصوص ہے۔ اور وہ لوگ جو رسالت اور بشریت کو حیات رسالت میں علیحدہ علیحدہ دیکھنے کے عادی ہیں ان کو اس حدیث کے الفاظ کو بشریت کے عام تقاضوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے اور اس میں رسولؐ کو تقاضائے بشریت کے ماتحت اپنی سب لڑکیوں کو شریک کرنا چاہیے تھا لیکن رسولؐ کا اپنی دونوں لڑکیوں کو ہمیشہ نظر انداز کرنا اور جناب سیدہؑ کا ذکر بار بار کرنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ رسولؐ کی صرف ایک ہی بیٹی تھی اور وہ ہیں جناب سیدہؑ صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہا۔ اور جو کچھ بھی آپ نے احادیث میں ارشاد فرمایا ہے وہ سب رسالت کے تقاضوں کی انجام دہی ہے۔ ایک باپ اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ رہا ہے بلکہ

خاتم الانبیاءؐ اپنے فریضہ ہدایت کے سلسلہ میں جناب سیدہؑ کی عظمت سے دنیا کو روشناس کرا رہے ہیں اور بضعۃ منی کہہ کر دنیا والوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ سیدہؑ شریک کار رسالت ہیں اور عورتوں کو ہدایت کی تکمیل کے لئے سیدہؑ کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے اور بغیر اس اتباع کے صحیح معنی میں ہدایت یافتہ ہونے کا تصور ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔ خواہ وہ خاتون بخیال خود کتنی ہی عظیم منزلت پر کیوں نہ فائز ہوں۔

دوسری بات جو اس حدیث سے واضح ہوتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے ان عام جذبات احترام کے بظاہر بالکل منافی معلوم ہوتی ہے جو ان کے دلوں میں جناب سیدہؑ کے لئے ہونے چاہئیں۔ یعنی ارشاد رسالت یہ ہے کہ "سیدہؑ میرا جز و حصہ ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی"

اس حدیث میں جناب سیدہؑ کی اذیت پہونچانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حدیث مدینہ میں بیان فرمائی گئی۔ جب مدینہ مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں بدر و احد کے غازی بھی تھے مہاجر و انصار بھی تھے۔ رسولؐ کے جاں نثار بھی تھے اور اولاد رسولؐ کے پرستار بھی تھے۔ کون مسلمان یہ کہہ سکتا تھا کہ اسے سیدہ عالمیہ سے محبت و الفت نہیں ہے۔ خاص طریقہ سے وہ صحابہ جو رسولؐ سے بہت قریب تھے ان کے دل میں جناب فاطمہؑ کی کبھی عزت بے حد رہی ہوگی۔ اس حدیث میں کفار و مشرکین کی جانب سے اذیت کا

کوئی اشارہ بھی نہیں ممکن ہے اس لئے کہ ان کی طرف سے دی گئی اذیت رسولؐ کی اذیت کیسے ہو سکتی ہے بعض احادیث سے واضح اشارے اس بات کے بھی ملتے ہیں کہ جناب سیدہؑ کے بارے میں ارشاد رسالت یہ بھی تھا کہ تم میرے بعد مجھ سے بہت جلد ملاقات کرو گی۔ اس روایت کی راوی بھی جناب عائشہ ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ علم رسالت میں یہ بات بھی تھی کہ حیات سیدہؑ رسولؐ کے بعد مختصر ہو گی اور پھر اپنی اسی ایک لڑکی کے بارے میں رسولؐ کو "اذیت" کا احساس کیوں تھا؟ وہ کیوں مسلمانوں کو متنبہ کرنا چاہتے تھے کہ اسے یاد رکھنا کہ سیدہؑ کی اذیت میری اذیت ہے۔ مسلمانوں کا نقطۂ نظر جناب سیدہؑ کے بارے میں الفت و محبت کا ہونا چاہیئے لیکن رسولؐ اذیت کا تصور پیش کر رہے ہیں۔ اتنی ساری احادیث جناب سیدہؑ کے بارے میں رسول اکرمؐ مسلمانوں کے مجمع میں پیش کر چکے ہیں ان کی بے پناہ محبت کے مظاہرے مسلمانوں کے سامنے کی بات ہے۔ آخر یہ رسول اکرمؐ کو احساس کیوں ہے کہ سیدہ کو میرے بعد اذیت ہو گی۔ اور اگر احساس نہیں ہے تو اس غیر ضروری بات کے ارشاد فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ ان دو باتوں میں کسی ایک بات کا جواب دینا عام مسلمانوں کے لیے دشوار ہے۔ اس ارشاد رسالتؐ کے بعد جناب سیدہؑ کا قول بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ آپ کا وہ شعر جو آپ نے بعد رسولؐ ارشاد فرمایا تھا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "بابا آپ کے بعد میرے اوپر وہ مصیبتیں پڑیں جو اگر روز روشن پر پڑتیں تو وہ مثل شب ہائے تار کے ہو جاتے" یہ شعر

قول رسالتؐ کی تصدیق کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اذیت بعد رسولؐ جناب سیدہؑ کو مسلمانوں کے ہاتھوں پہونچی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمان کس منزلت کے حامل تھے۔ اب فرمان رسالتؐ حدیث کی شکل میں اور ارشاد جناب سیدہؑ دونوں کو ملا دیجئے تو نتیجہ یہ صرف نکلتا ہے کہ بعد رسولؐ اکابر صحابہ اور اہلبیت رسولؐ کے اختلافات اس منزل تک تھے کہ وہ جناب سیدہؑ کی تکلیف کا سبب بنے اور جناب سیدہؑ کی تکلیف رسولؐ کی تکلیف کا سبب بنی۔ اس لئے ہر حال میں جناب سیدہؑ حق پر تھیں اس لئے کہ خلاف حق ہونے پر اگر جناب سیدہؑ کو اذیت دی گئی ہوتی تو وہ جناب رسالت مآبؐ کی تکلیف کا سبب نہ بنتی۔ اور جناب رسول خداؐ اپنی حیات مقدس میں حدیث مذکور کو بیان فرما کر سیدہؑ کے کردار کی وضاحت بھی کر رہے تھے اور مسلمانوں کو متنبہ بھی کر رہے تھے کہ تم میرے بعد ایسی کوئی بات نہ کرنا جو میری تکلیف کا سبب بنے۔ اب تاریخ خواہ جناب سیدہؑ کی اذیت کی داستان بیان کرے یا نہ کرے، یا مسلمانوں کے عقائد و نظریات صحابہ و اہلبیتؑ کے باہمی تعلقات کے بارے میں کچھ بھی ہوں لیکن فرمان رسالت تاریخ کی بھی اصلاح کر رہا ہے اور مسلمانوں کے نظریات و عقائد کی بھی۔ اس لئے کہ اذیت کا وجود زبان رسالتؐ سے اور جناب سیدہؑ کے قول سے ثابت ہے۔ خود جناب سیدہؑ کے مرثیہ کا شعر بھی یہی بتاتا ہے کہ جناب سیدہؑ صرف اپنی کیفیت غم کو عام طور

سے نہیں بیان کر رہی ہیں بلکہ اس اذیت کو اپنے عالی مرتبت باپ سے بطور شکوہ بیان کر رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خود جناب سیدہؑ کے بھی پیش نظر یہ حدیث رسولؐ ہے کہ "جس نے سیدہؑ کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی" مذکورہ بالا تفصیل کو اگر مجمل طور پر بیان کیا جائے تو حسب ذیل نتائج واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ سرور عالمؐ کی صرف ایک صاحبزادی جناب سیدہ تھیں جو حضرت علیؑ کی شریک حیات اور جناب حسنینؑ کی مادر گرامی تھیں۔ دوسری لڑکیاں جو مورخین نے درج کی ہیں وہ آپ کی پروردہ تھیں۔ محققین کسی غلط فہمی کی بنیاد پر یا عمداً جناب سیدہؑ کی فضیلتوں میں اور حضرت علیؑ کے فضائل میں مساوات اور عمومیت پیدا کرنے کے لئے مورخین نے دختران رسولؐ لکھا ہے اور یہی موقف اسلام کے ایک اہم فرقہ کا بھی ہے۔ وہ رسولؐ کی صرف ایک ہی بیٹی کو تسلیم کرتا ہے عمل رسالت بھی اور قول رسولؐ بھی صرف ایک ہی بیٹی کی نشان دہی کرتا ہے۔

۲۔ جناب سیدہؑ (جو بلا کسی اختلاف کے دختر رسولؐ ہیں) کے بارے میں سرور عالمؐ کو یہ احساس تھا کہ ان کے بعد انکی بیٹی کو مسلمانوں کے ہاتھوں اذیت اور تکلیف پہونچے گی اور یہ اذیت اور تکلیف ناحق پہونچائی جائے گی سیدہؑ حق پر ہونگی۔ اسی لئے

سیدہؑ کی اذیت کو رسولؐ نے اپنی اذیت کو محسوس کیا ہے۔

۳۔ جناب سیدہؑ کو بضعۃ منی کہہ کر رسولؐ نے دنیا کی عورتوں کے سامنے یہ بات واضح کر دی تھی کہ سیدہؑ شریک کار رسالت ہیں اور دنیا کی تمام عورتوں کو جناب سیدہؑ کی تقلید کرنی چاہیئے خواہ کسی مرتبہ کی کیوں نہ ہوں۔

۴۔ جناب سیدہؑ کو جنت کی عورتوں کی سردار بنا کر سرورِ عالمؐ نے اصطلاحی اور عملی حیثیت سے معصومہؑ قرار دیا ہے اس لیے کہ جنت میں جناب مریم بھی ہوں گی جناب سارہؑ و حواؑ بھی ہونگی چونکہ حدیث رسولؐ میں کوئی استثناء نہیں ہے اس لیئے یقیناً جناب سیدہؑ تمام خواتین کی سردار ہوں گی اور ایسی صورت میں دُنیا کی غیر معصومہ عورت جنت میں معصومہ عورتوں کی سردار ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر یہ کہ جنت میں مراتب دُنیا کے عمل کے نتیجہ میں ہونگے۔ جنت کی سرداری خواہ کسی کو ملے وہ اپنے اعمال کے لحاظ سے ان تمام جنت والوں سے جن کا وہ سردار ہو گا بہرحال افضل ہو گا۔ اسی لیئے جناب حسنینؑ کو جب جوانانِ جنت کا سردار بنایا گیا تو اسی حدیث میں استثناء کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ "حسنؑ و حسینؑ۔ جوانان اہل جنت کے سردار ہیں اور ان کے باپ ان سے افضل ہیں" جو اس شرف کو عطا کر رہا ہے یعنی خود رسول اکرمؐ وہ سب سے افضل علیؑ کا استثناء ہو چکا ہے۔ ماں جنت کی خواتین کی سردار ہے اس لیئے عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ ان شخصیتوں کے بعد حسنینؑ کو سب سے افضل مانو خواہ انبیاءؑ ہوں یا اوصیاء یا کوئی

اور ورنہ اگر علیؑ کے سوا کوئی استثناء ضروری ہوتا تو رسولؐ خود اس ذات کو یا اس طبقہ کو یا اس سلسلہ رشد و ہدایت کو مستثنیٰ فرما دیتے۔ اسی طرح جناب سیدہؑ کی سرداری کے بارے میں بھی کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔ حسنینؑ کے بارے میں بھی کوئی استثنیٰ نہیں ہے اس لیے یہ ذوات مقدسہ رسولؐ و علیؑ کے بعد سب سے افضل ہوں گے اور اسی جوانان اہل جنت کی حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ جناب حسنین علیہم السلام بلاکسی شک و شبہہ کے معصوم ہیں اس لیے کہ انبیاء کرام تمام مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بلاکسی اختلاف کے معصوم ہیں اور جناب حسنینؑ کی جنت کی سرداری سب پر مسلم ہے اس لیے معصوم افراد کا سردار غیر معصوم کیسے ہو گا۔

دوسری حدیث

ارشاد حضرت سرورِ عالمؐ کہ "سلمان ہم اہلبیتؑ میں سے ہیں"۔ عجم کے رہنے والے مسلمان جو سلمان فارسی کہلاتے تھے۔ ان کو اہل بیتؑ کے زمرہ میں شامل کیا گیا اور وہ سلمان محمدیؐ کہلانے لگے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ اعلان کہ "سلمان ہم اہلبیتؑ میں سے ہیں"، پورے سلسلہ رشد و ہدایت کی تاریخ میں ایک اہم بات کی نشان دہی کرتا ہے اور یہ اصول متعین کرتا ہے کہ اسلام نے سب سے زیادہ زور کردار انسانی پر دیا ہے۔ اگر کردار نہیں تو کچھ بھی نہیں

بالخصوص پیغمبرؐ سے قربت حاصل کرنے کے لئے اور پیغمبرؐ کی محبت حاصل کرنے کے لئے صرف کردار کی ضرورت ہے اس اصول کے دو رخ ہیں دونوں کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کرنا ہے تاکہ بات واضح ہو جائے۔

۱۔ رشتے اور عزیز داریاں بغیر کردار کے بارگاہ نبوتؐ میں قربت کا ذریعہ نہیں بن سکتی ہیں۔ اور نہ نجات کا ضامن ہو سکتی ہیں۔

۲۔ کردار کی بلندی اور عظمت بغیر سابقہ قرابت داری کے بھی قربت پیغمبرؐ کا سبب بن سکتا ہے اور نجات کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اب مسلمان قرابت پیغمبرؐ پر جتنا بھی چاہے زور دے اور جو عقیدہ بھی رکھے لیکن یہ حدیث بغیر کردار صرف ظاہری قرابت پیغمبرؐ کی بنا پر عظمت و تقدس کے تصور و عقیدہ کی نفی کرتی رہے گی اور اس کو باطل قرار دیتا رہے گی۔

۱۔ ابتدائے خلقت کے بعد ہی انسان گمراہی میں مبتلا ہو چکا تھا اور نباض فطرت بشر نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب ان افراد کو طوفان میں غرق کئے جانے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا ہے اسی لئے عذاب کی استدعا کی گئی اور وہ عذاب طوفان نوحؑ کی شکل میں آیا۔ جناب نوحؑ اپنے ساتھ بہت تھوڑے سے ہدایت یافتہ افراد کو لے کر کشتی میں سوار ہو گئے لیکن خود ان کا فرزند انکے ساتھ کشتی میں سوار نہیں ہوتا اور کشتی کے بجائے پہاڑ کو زیادہ محفوظ

سمجھتا ہے۔ جناب نوحؑ بارگاہ ایزدی میں عرض کرتے ہیں کہ یہ میرے
اہل میں سے ہے (ھذا من اھلی) کوئی کم فہم یہ سمجھ سکتا ہے کہ
جناب نوحؑ معاذ اللہ محبت اولاد میں گرفتار تھے لیکن جناب
نوحؑ پوری دنیا کو جسے اب طوفان کے بعد از سر نو آباد ہونا ہے
یہ بتا دینا چاہتے تھے اور ہمیشہ کے لئے اس اصول کو متعین کر دینا
چاہتے تھے کہ اہلبیت پیغمبر کا معیار صلب نہیں بلکہ کردار ہے۔
اسی لئے شاید جناب نوح نے ابنی (یعنی میرا فرزند) کی لفظ نہیں
صرف فرمائی بلکہ اہلی کی لفظ صرف فرمائی۔ بیٹے کو بچانا تھا لیکن
معیار اہلبیتؑ کا مقرر کیا جا رہا تھا۔ فضا میں آواز ضمیر کی بلند ہوئی
اور خالق کا جواب بھی سنائی دیا "لیس من اھلک انہ عمل
غیر صالح یہ آپ کے اہل سے نہیں ہے اس لئے کہ یہ عمل غیر صالح
رکھتا ہے"۔ خالق کا جواب بھی صاف تھا یہ نہیں کہا کہ یہ آپ کے صلب
سے نہیں ہے بلکہ یہ ارشاد ہوا کہ آپ کے اہل سے نہیں ہے۔ چونکہ
عمل غیر صالح کا حامل ہے۔ اور اسی وقت قیامت تک کے لیے یہ اصول
طے پا گیا کہ اہلبیتؑ پیغمبر ہونے کے لئے عظمت کردار کی ضرورت ہے
اور اس پورے واقعہ کو تفصیل سے قرآن میں اسی لئے بیان کر دیا گیا
کہ قیامت تک باقی رہنے والی کتاب کے ذریعہ بطور سند اسے
پیش کیا جا سکے۔

یہ امر خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پسر نوح کے لئے

قرآن مجید نے جو لفظ صرف کی ہے وہ اس کے جرائم اور اعمال کے پیش نظر بہت ہلکی لفظ ہے۔ وہ نبوت کا قائل نہ تھا اس لیئے وہ یقیناً وحدانیت کا بھی قائل نہ رہا ہو گا۔ اسے نبوت سے انکار کے جرم میں غرق کر دیا گیا تو کیا اسے عمل غیر صالح کی لفظ کے بجائے کافر یا مشرک نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لیکن قرآن میں صرف عمل غیر صالح کی لفظ صرف ہوئی ہے جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اصل میں شاید اس کے عمل کی شرارت کا بیان مقصود باری نہیں ہے بلکہ اہلبیت پیغمبرؑ کے معیار عمل کی نزاکت کو بیان کیا جا رہا ہے۔ اگر جناب نوحؑ کے سوال کے جواب میں ارشاد خالق یہ ہوتا کہ یہ آپ کے اہل سے نہیں ہے اس لیئے کہ کافر ہے یا منافق ہے یا مشرک ہے تو بہت خوب۔ اہلبیت پیغمبرؑ کے معیار عمل سے علیحدہ کرنے کے لیئے شرک کفر اور نفاق حد فاصل بنتے صرف عمل غیر صالح نہ ہوتا۔ اب کفر و نفاق کے بجائے کوئی بھی عمل غیر صالح اہلبیت رسولؐ کے زمرہ سے علیحدہ کر دینے کے لیئے کافی ہے اور یہ معیار قرآن میں بیان ہوا ہے۔ اس کا مطلب واضح طور سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ذوات جو اہلبیت پیغمبرؐ کے زمرہ میں شامل ہیں وہ خواہ اصطلاحی طور پر معصوم نہ ہوں لیکن عملی طور پر ان کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ ورنہ وہ عمل غیر صالح کی زد میں آ جائیں گے۔ خواہ وہ نسل پیغمبرؐ سے کیوں نہ ہوں۔ یہ تھا وہ معیار جو بالکل ابتداء انسانیت کے دور میں اہلبیت پیغمبرؑ کے بارے میں طے پا گیا تھا۔ لیکن اس سے تصویر کا صرف ایک رخ واضح طور پر نمایاں ہوا تھا۔ وہ یہ کہ اگر قرابت داران پیغمبرؐ میں کوئی شخص عمل غیر صالح

رکھتا ہے تو خواہ وہ اولاد پیغمبرؐ ہی کیوں نہ ہو اہلبیت پیغمبرؐ کے زمرہ میں شمار نہ ہوگا۔

۲۔ لیکن اس اصول کا دوسرا رخ یعنی کردار کی بلندی بغیر کسی سابقہ قرابت داری کے بھی قربت پیغمبرؐ کا سبب بن سکتی ہے یا نہیں اس کی کوئی مثال فرد کی شکل میں سامنے نہیں آئی تھی اور تصویر کا یہ رخ اب ارشاد حضرت ختم الانبیاءؐ کے بعد مکمل ہوگیا کہ "سلمان ہم اہلبیتؑ میں سے ہیں" اس ارشاد نبویؐ نے یہ بتا دیا کہ اہلبیت پیغمبرؐ ہونے کے لئے قرابت داری اور رشتہ ضروری نہیں ہے بلکہ اصل شئے کردار ہے۔ فارس کا رہنے والا سلمانؓ بھی اہلبیت پیغمبرؐ میں شامل کیا جا سکتا ہے اگر وہ عظیم کردار کا حامل ہو اور عمل صالح رکھتا ہو۔ تصویر کا ایک رخ ابتداء انسانیت میں سامنے آیا اسکی اور بھی مثالیں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہیں۔ قابیل کا واقعہ پسر نوح کے قبل کا ہے اس لئے پہلے اس کا تذکرہ ہونا چاہیئے نہ کہ بعد میں۔ چنانچہ برادران یوسفؑ بھی اسی معیار کی نمائندگی کرتے رہے جو پسر نوح کا متعین ہو چکا تھا۔ اور قرآن ہر ایک کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کرتا رہا تاکہ آنے والی دنیا اس سے سبق لے سکے۔ لیکن مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جناب سلمانؓ کے قبل پوری تاریخ رشد و ہدایات میں کوئی غیر اپنے کردار کے ساتھ اس طرح نمایاں نہ ہوا تھا کہ اسے کوئی نبیؑ یا رسولؐ اپنے اہلبیتؑ میں شامل کرتا۔ آخری مرحلہ نبوت میں جناب سلمانؓ آئے اور انھوں نے زبان پیغمبرؐ سے اپنے

بارے میں مذکورہ حدیث کی سند لے کر تصویر کے دوسرے رخ کو مکمل کیا۔ اور ہمیشہ کے لئے یہ اعلان ہو گیا کہ اہلبیتؑ پیغمبر ہونے کے لئے صرف کردار کی ضرورت ہے خواہ یہ اپنوں میں ہو یا غیروں میں خواہ ملکی ہیں ہو یا غیر ملکی میں۔ خواہ قریش میں ہو یا غیر قریش میں۔

سرور عالمؐ کی یہ حدیث مسلمانوں کے عقائد اور نظریات کی بھی اصلاح کر رہی ہے۔ جناب سلمانؓ صحابی ہیں اور جو بھی بزم رسالت میں آ کر شامل ہوا وہ صحابی رسولؐ کے شرف سے مشرف ہوا۔ جنگ احد کے موقع پر جب خندق تیار کی جا رہی تھی تو ایک صحابی خندق کھودتا تھا دوسرا مٹی اٹھا کر باہر ڈالتا تھا اس طرح دو آدمیوں پر رقبہ تقسیم کر دیا گیا۔ انصار نے انصار کو اپنا ساتھی بنایا مہاجر نے مہاجر کو۔ خود سرور عالمؐ کے ساتھ حضرت علیؑ تھے جناب سلمان نے دونوں کام خود سنبھال لئے۔ خود ہی خندق کھودتے اور خود ہی مٹی پھینکتے تھے اور انھوں نے اس کام کو اس خلوص سے انجام دیا کہ ہر ایک نے جناب سلمانؓ کو اپنانا شروع کیا۔ مہاجر نے یہ کہہ کر جناب سلمانؓ کو اپنانے کی کوشش کی کہ چونکہ وہ مدینے کے ساکن نہیں ہیں اس لئے مہاجر ہیں اور جب مہاجر ہیں تو ہم میں سے ہیں۔ انصار نے مہاجر کے خلاف یہ نکتہ پیدا کیا کہ چونکہ مہاجر سب کے سب مکے کے ہیں اور سلمان مکے کے رہنے والے

نہیں ہیں اس لئے "سلمانؓ ہم میں سے ہیں" یہ مسئلہ ہادی عالمؐ تک پہونچا اور انھوں نے یہ ارشاد فرمایا کہ "سلمانؓ ہم اہلبیتؑ میں سے ہیں" اس پورے پس منظر پر نگاہ ڈالیے اور اس کے بعد جناب سلمان کی منزلت پر غور کیجیے صحابی سب تھے خواہ انصار ہوں یا مہاجر۔ ہر ایک جناب سلمانؓ کو اپنے میں شامل کر رہا تھا رسولؐ نے دونوں گروہوں سے علیحدہ کرکے اپنے اہلبیتؑ میں شامل کر لیا۔ اب کون ہے جو اس بات سے انکار کرے گا کہ جناب سلمانؓ کے شرف میں اضافہ نہیں ہوا۔ مہاجر و انصار جناب سلمانؓ کو اپنے ساتھ رکھ کر اپنے شرف میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ رسولؐ نے سلمان کو اپنے ساتھ کہہ کر جناب سلمانؓ کے شرف میں اضافہ کردیا اور ان کی منزلت کو بڑھا دیا اور اس طرح ہمیشہ کے لئے یہ فیصلہ کردیا کہ صحابی جب ترقی کرتا ہے جب اسکی منزلت میں اضافہ ہوتا ہے تب وہ اہلبیتؑ سے قریب ہوتا ہے یعنی صحابیت کی منزل اہلبیتؑ کے درجہ سے پست ہے۔ کوئی بھی صحابی ہو، کسی منزل کا کیوں نہ ہو وہ باعتبار شرف اہلبیتؑ سے پست ہی ہوگا اس طرح مسلمانوں نے خلافت کو جو شرف دیا ہے اور فضیلت باعتبار خلافت کا جو معیار قائم کیا ہے وہ جناب سلمانؓ کے بارے میں اس حدیثؐ کے ارشاد فرمانے کے بعد ہمیشہ کے لئے رد ہو جاتا ہے واقعہ کا ہر پہلو یہی بتاتا ہے کہ جب صحابہ انھیں اپنانا چاہتے تھے

خواہ مہاجر ہوں یا انصار تو رسول اکرمؐ نے ان کے شرف میں اضافہ کرکے ان کو اپنا بنایا اور وہ بھی ایسے وقت میں جب وہ باعتبار کردار و عمل ہر صحابی سے بلند و برتر ہو چکے تھے تب ان کو قربت اہلبیتؑ کا شرف ملا۔ اس لئے اب اہلبیتؑ کے مقابلہ میں صحابیت کے شرف کا تصور عصبیت تو ہو سکتا ہے حقیقت نہیں بن سکتا۔

تیسری حدیث

ارشاد حضرت سرور عالمؐ کہ "میرے ازواج میں ایک کے اوپر مقام حوآب میں کتّے بھونکیں گے اور اس دن وہ باطل پر ہوگی۔"

چوتھی حدیث

ہادی عالم جناب رسول خداؐ نے اپنے صحابی جناب زبیر کو مخاطب کرکے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ "تم ایک دن علیؑ سے جنگ کروگے اور اس دن تم باطل پر ہوگے۔"

پانچویں حدیث

رہبر انسانیت جناب ختم الانبیاءؐ نے اپنے بزرگ مرتبہ صحابی جناب عمارؓ کو مخاطب کرکے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اے عمارؓ "تم کو گروہ باغی قتل کرے گا تم ان کو جنت کی طرف بلاتے ہوگے اور

وہ تم کو دوزخ کی طرف بلاتے ہوں گے!!

یہ تین حدیثیں دو جنگوں کے بارے میں ارشاد ہوئی ہیں۔ اور ان تینوں جنگوں کے بارے میں مسلمانوں میں آج تک اختلاف رائے ہے۔ اور شاید قیامت تک یہ اختلاف باقی رہے گا۔

اسلام کا ایک فرقہ ان تمام معرکوں میں حضرت علیؑ کو ہر حال میں حق پر سمجھتا ہے اور ان کے مخالفین کو باطل پر سمجھتا ہے۔

دوسرا فرقہ یہ رائے رکھتا ہے کہ بلاشبہ ان تمام جنگوں میں حضرت علیؑ حق پر تھے لیکن ان کے مخالفین سے ان جنگوں میں خطاء اجتہادی سرزد ہوئی تھی اس لئے وہ اس غلطی کے باوجود موجب اجر و ثواب ہوں گے اس طرح قاتل و مقتول کم و بیش دونوں ایک ہی منزل میں ہوں گے۔

تیسرا انتہا پسند طبقہ وہ ہے (اگرچہ یہ لوگ زیادہ نہیں ہیں) جو ان تینوں جنگوں میں حضرت علیؑ کے مخالفین کو شاید حق پر سمجھتا ہے اور ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان لوگوں نے حضرت علیؑ سے جنگ کر کے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

یہ مسلمانوں کے تین طبقہ خیال کے لوگ آج تک باقی ہیں اور جب یہ معرکے ہوئے تھے اس کے بعد ہی سے زبان و قلم کے معرکے آج تک جاری ہیں۔

آئیے اس سلسلہ میں عقل و نقل کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ

مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان تینوں جنگوں کے بارے میں کیا نقطۂ نظر ہے اور ان کی کیا رائے ہے۔ اور وہ ان تینوں گروہوں میں سے کس گروہ کی تائید فرماتے ہیں اور جو رائے رسولِ اکرمؐ کی ہوگی وہی حق ہوگی اور باقی تمام رائیں باطل ہوں گی۔

ان تینوں جنگوں میں حالات کی بدنصیبی یہ بھی کہ یہ ہمیں دونوں طرف بزمِ رسالتؐ کے بیٹھنے والے اصحاب ایک دوسرے کے سامنے فریقِ مخالف کی حیثیت سے نمایاں ہوئے اور عام مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ حق کدھر ہے اور باطل کدھر۔ جنگِ جمل میں ایک طرف کاشانۂ نبوت میں رہنے والی زوجۂ رسولؐ تھیں جو ام المومنین کے لقب سے ملقب تھیں تو دوسری طرف برادرِ رسولؐ اور داماد رسولؐ تھا اس طرح صحابہ بھی دو طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ اس وقت جو شخص بھی نیک نیتی سے تلاشِ حق کرنا چاہتا ہے اس کے ذہن کو سہارا دینے کی ضرورت ہے اور یہ سہارا حضرت رسولؐ کی ذات ہی دے سکتی ہے اور وہی فیصلہ کن ہو سکتی ہے۔

اگر نگاہِ غائر سے دیکھا جائے تو جنگِ جمل و صفین و نہروان کے بارے میں احادیثِ رسولؐ اتنی واضح اور اس قدر نمایاں ہیں کہ اتنی نمایاں اور واضح احادیث صلح امام حسنؑ اور

جنگ کربلا کے بارے میں نہیں ہیں۔

یعنی واقعات کربلا میں شریک دونوں فریقوں میں سے کسی ایک سے کبھی رسول اللہؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ تم حسینؑ کے موافق یا مخالف جنگ کروگے اور اس دن تم حق پر ہوگے یا باطل پر ہوگے۔ یا اسی طرح کے موضوع سے ملتی جلتی کوئی حدیث کم از کم میری نگاہ سے نہیں گذری۔ میرا مطالعہ اس طرح کی حدیثوں کے بارے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں نے نہ کسی سے سنا نہ کہیں دیکھا۔ لیکن جنگ جمل و صفین و نہروان کے شرکاء کے بارے میں واضح احادیث اور اعلانات موجود ہیں۔ ہادی عالمؐ نے کوئی ایک موقع بھی نظر انداز نہیں کیا جہاں تبلیغ کے فرائض نہ ادا کیے ہوں۔ یہ واضح احادیث بلا کسی اختلاف کے ہر فرقہ کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ آخر اس کا کیا راز ہے۔ حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ کے بارے میں ولادت کے بعد ہی سے سرورِ کائناتؐ کے گریہ کی روایات تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ واقعہ کربلا میں ہونے والے مظالم کو رسولِ خداؐ گویا حال کے آئینہ میں بہ نفسِ نفیس ملاحظہ فرما رہے تھے لیکن اس کے باوجود واقعہ کربلا کے بارے میں اتنی واضح احادیث نہیں ملتی ہیں جتنی جمل و صفین کے بارے میں ملتی ہیں۔ یقیناً رسولِ خداؐ یہ جانتے تھے کہ جمل کا معرکہ وہ پہلا مرحلہ ہوگا جب مسلمانوں کے

اختلافات اتنے زیادہ ہو جائیں گے کہ ان کی اکثریت تلوار لے کر ایک دوسرے کے مد مقابل ہو جائے گی، اور جمل ہی کی جنگ سے صفین کے لئے راہ ہموار کرلی جائے گی۔ اور یہ سب کچھ حق کے نام پر کیا جائے گا، اور ایسی شخصیتیں میدان میں ہوں گی کہ عام مسلمانوں کو یہ دھوکہ ہوگا کہ حق کدھر ہے باطل کدھر ہے اس لئے رسول خداؐ نے صحیح احادیث کے ذریعہ مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ ادا کر دینا چاہتے تھے اور انھوں نے ایسا کر دیا۔ سرور عالمؐ ام المومنین عائشہ کے مزاج سے بھی واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ام المومنین کو اپنے جذبات پر قابو نہیں رہ جاتا ہے۔ ام المومنین صفیہ کے چینی کے پیالے کو انھوں نے محض اس لئے چکنا چور کر دیا تھا کہ ان کی باری کے دن میں حضرت صفیہ نے کوئی چیز کیوں رسولؐ کے لئے پکا کر دی کی۔ ام المومنین حضرت خدیجہؓ کو جب سرور عالمؐ نے ام المومنین عائشہ کے سامنے یاد کیا، حالانکہ یہ یاد ان کی وفات کے بعد تھی پھر بھی ام المومنین عائشہ اپنی ناراضگی کے اظہار میں ذرا بھی تکلف سے کام نہ لے سکیں۔ اگرچہ رسول خداؐ کو ان کے اس اعتراض پر ہمیشہ تکلیف ہوتی تھی۔ واقعہ تحریم ام المومنین ماریہ قبطیہ کے ساتھ انھیں کی بدسلوکی کی بنیاد پر عالم وجود میں آیا تھا۔ اسی لئے رسول اکرمؐ اتمام حجت کے ہر فریضہ کو ادا کر دینا چاہتے تھے۔

ام المومنین عائشہ کی بدنصیبی یہ تھی کہ قدرت نے انھیں دولت اولاد سے محروم کر دیا تھا۔ یہ محرومی بہت سے ازواج کا مقدر بنی تھی۔ لیکن ہر ایک کے احساسات مختلف ہوتے ہیں۔ کچھ ازواج رسولؐ جیسی نعمت پا کر اپنے ماضی و حال و مستقبل سے بے فکر ہو کر رہ گئیں۔ انھوں نے شاید یہ سوچا ہو کہ اب اور مانگنا کیا باقی رہ گیا۔ لیکن ام المومنین عائشہ شاید اپنے مستقبل کے احساسات سے بے نیاز نہ رہ سکیں۔ دولت اولاد سے محرومی کے باعث انھوں نے اپنی مادری محبّت کو اپنے بھانجے عبداللہؓ بن زبیر میں ضم کر دیا تھا۔ اور عبداللہ بن زبیر نے ام المومنین کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

پہلی خلافت کے موقعہ پر جب خلافت کو کردار کا تابع نہ بنایا گیا بلکہ کردار کو تابع خلافت بنانے کی کوشش کی گئی۔ اسی وقت سے بہت سے دلوں میں خلیفہ بننے کی تمنّا پیدا ہوئی تھی لیکن تیسری خلافت کا زوال جس پس منظر میں ہوا اس کے نتیجہ میں لوگ کردار کی تلاش میں علیؑ کے دروازے تک آئے۔ مولائے کائناتؑ کے خلیفہ ہونے کے باعث بہت سے لوگوں کی تمنائیں خاک میں مل گئیں۔

عبداللہ بن زبیر کو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا۔ انھوں نے سوچا ہوگا کہ ان کی مانند مہربان زوجۂ رسولؐ ہیں۔ ام المومنین ہیں، مسلمانوں کے پہلے خلیفہ کی دختر ہیں۔ بہت سے جاہ پرست صحابہ کی طاقت بھی ان کے ساتھ ہے۔ ان کے مقابل علیؑ تھا۔ جو اگی سوت ام المومنین

حضرت خدیجہؑ کے داماد ہیں۔ علیؑ کی طاقت پچھلے چھبیس ۲۶ برسوں میں کمزور بھی کی جا چکی ہے۔ علیؑ کی پشت پناہی ان کے کردار کے سوا کون کرے گا۔ یہاں پوری دنیا اپنے ساتھ ہے۔ لوہا گرم ہو چکا ہے صرف موڑنے کی ضرورت ہے اگر علیؑ کو اس جنگ میں شکست دی جا سکی تو ظاہر ہے کہ ام المومنین خود خلیفہ نہ ہوں گی لیکن خلیفہ گر ضرور ہونگی اس طرح سے خلافت کا ہما زبیر کے سر پر منڈلائے گا۔ اور باپ کے مرنے کے بعد یہ خلافت بلا شرکت غیرے مجھے مل جائے گی۔

عبداللہ بن زبیر کو خلیفہ ہونے کی بے حد خواہش تھی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش انھیں جنگ جمل کے ذریعہ ملی۔ اس خواہش کی انتہا واقعہ کربلا کے بعد ہوئی۔ انھوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کی سعی کی جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

ام المومنین عائشہ قتل حضرت عثمان کا فتویٰ دے کر مکہ چلی گئی تھیں، اور وہ قتل بھی ہو گئے۔ اب حضرت علیؑ کے لئے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں ام المومنین حضرت عائشہ طوفان کی طرح مکہ سے اٹھیں، اور ہوش سے بے نیاز ہو کر جوش کے عالم میں آندھی کی رفتار سے چلیں۔ مصر کا مال غنیمت کثرت لشکر اندھے عقیدت مندوں کا ہجوم لے کر منزلیں مارتی ہوئی وہ آگے بڑھ رہی تھیں، اور آیت قرآنی "فقد صغت قلوبکما" کی عملی تفسیر بنی ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا قافلہ آگے بڑھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود مقام حوآب پر کتوں کے بھونکنے کی آواز سے بے نیاز نہ رہ سکیں۔

آواز کا کانوں میں گونجنا تھا کہ عہد رسالتؐ کا نقشہ ذہن میں پھر گیا شاید وہ سماں یاد آ گیا ہو جب امہات المومنین کے مجمع میں سرورِ عالمؐ ارشاد فرما رہے تھے کہ "میرے ازواج میں سے ایک پر مقام حوآب پر کتے بھونکیں گے اور اس دن وہ باطل پر ہوگی۔ اور اے حمیرا کہیں وہ تم نہ ہونا" اب کتوں کی آواز نے دماغ کے سارے تار جھنجھنا کے رکھ دیے ہوں گے۔ ہادی عالمؐ کا یہ ارشاد یاد آ گیا ہوگا۔ دلیل سے پوچھا یہ کون سی جگہ ہے اس نے تصدیق کر دی کہ یہ مقام حوآب ہے۔ ناقہ کی واپسی کا حکم ہوا، اور اس کے بعد جھوٹی گواہیاں دلائی گئیں کہ یہ حوآب نہیں ہے۔ اور ام المومنین نے اپنے ضمیر کے لئے اطمینان کا جھوٹا سہارا تلاش کر لیا۔ لیکن ہادی عالمؐ کی حدیث نے فریضہ تبلیغ ادا کر دیا۔ ابہام دور کر دیا۔ حق کو ہر شک و شبہ سے بالاتر کر دیا۔ میدان جمل میں جناب زبیر کو حدیث رسولؐ خود مولائے کائناتؑ نے یاد دلائی۔ زبیر نے بہت تاخیر کر دی تھی اور ان کے ذریعہ سے جو لوگ گمراہ ہوئے وہ راست پر نہ آ سکے لیکن راستہ میں اور میدان جنگ میں ہر جگہ ابہام کے پردوں کو چاک چاک کر دیا گیا۔ رسولؐ گویا مسلمانوں کے شعور سے یہ کہہ رہے تھے یہ موقع جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینے کا ہے۔ میں علیؑ کی حقانیت کے بارے میں جو کچھ کہہ چکا ہوں وہ اگر تم بھول چکے ہو تو کم از کم وہ تو یاد رکھو جو میں نے تمہارے بارے میں کہا ہے۔ اصل مسئلہ تمہاری نجات کا ہے۔ تمہاری رہنمائی کے لئے میں موجود ہوں۔ مگر کون سنتا ہے۔

جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔

اب جنگ صفین کا مرحلہ ہے یہاں رسول اکرمؐ نے ایک شخص کو لا کر میدان میں کھڑا کر دیا اور اسکی شہادت کو معیار حق و باطل قرار دیا "اے عمارؓ تم کو گروہ باغی قتل کرے گا تم کو وہ دوزخ کی دعوت دیتا ہوگا اور تم اسے جنت کی طرف بلاتے ہو گے" اس حدیث کے پہلے حصہ میں قاتلین جناب عمارؓ کو باغی قرار دیا گیا ہے دوسرے حصہ میں جناب عمارؓ کی دعوت کے حاصل کو بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ ہر طرح کا ابہام دور ہو جائے اور شک و شبہہ کی فضا ختم ہو جائے۔ ہر ایک کا مشاہدہ اس شہادت کا میدان جنگ میں گواہ ہوگا۔ عمارؓ کی شرکت جنگ خود ہر ایک کو یہ بتا دیگی کہ حق کی ہوا کدھر سے چل رہی ہے۔

وفات رسولؐ کے بعد حق و ناحق کے اختلافات راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کے مانند تھے لیکن اب وہ چنگاری شعلہ بن چکی تھی۔ مگر ہر موقع پر حدیث رسولؐ حق کے تحفظ کے لئے موجود ہے۔ حدیث رسولؐ مقام حواب پر گویا مسلمانوں کا اور ام المومنین کا راستہ روکے کھڑی ہے۔ اور غیر مکلف مخلوق کے ذریعہ گویا قدرت یہ اعلان کر رہی ہے کہ بے عقل انسانو! اگر تم کو شعور نہیں تو ہم تم کو آگاہ کر دیتے ہیں کہ یہ راستہ باطل کا ہے۔ میدان جمل میں حدیث زبیر کے پھیر کی محرک بن کر رہ گئی۔ صفین کا مرحلہ آیا تو صحابی رسولؐ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آگیا۔ دو جنگوں کا زمانہ بالکل

قریب قریب ہے۔ دو جنگوں کا مقصد بھی ایک ہی ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی جس نے محافظت کی تھی اسی پر قتل کا جھوٹا الزام عائد کیا گیا ہے۔ حالات کی بدنصیبی یہ ہے کہ امیر المومنینؑ خود ایک فریق بنا دیے گئے اس لیئے اب ان کی کون سنے گا اس لیئے ہر ابہام کو دور کرنے کے لیئے حدیث رسولؐ موجود ہے۔ اب گویا سردار عالمؐ یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ میں یہ کہتا ہوں کہ علیؑ کا مخالف گروہ باغی ہے اور دعوت دوزخ دیتا ہے۔ عمارؓ شہید ہو گئے اور ان کی شہادت نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ امیر شام کو تاویل کرنا پڑی کہ کچھ نہ کچھ کہنا تھا یہی کہہ دیا کہ چونکہ "علیؑ لائے تھے اس لیئے قاتل وہی ہیں ہم نہیں ہیں" مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کا جو جواب دیا ہے انھیں سے سنیئے وہ یہ فرماتے ہیں کہ "امیر شام کی تاویل اس لیئے غلط ہے کہ رسول خداؐ نے یہ کہاں فرمایا تھا کہ اے عمارؓ تم کو گروہ باغی اپنے ساتھ لائے گا سرور عالمؐ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اے عمارؓ تم کو گروہ باغی قتل کرے گا۔ قتل جس گروہ نے کیا وہ مصداق حدیث رسولؐ ہے۔

ابہام یہاں بھی دور کر دیا گیا۔ اب کوئی شک وشبہ نہ رہا۔ اب نہروان کی منزل ہے۔ نہروان کی جنگ صفین کا شاخسانہ ہے اگر صفین کی جنگ نہ ہوتی تو نہروان کا مرحلہ پیش آتا۔ یہاں بھی ذوالثدیہ والی حدیث رسولؐ موجود ہے اس لیئے کہ ابہام کے امکانات موجود ہیں۔ جو ماننے والے تھے وہ مان گئے جو نہیں ماننا چاہتے تھے وہ قتل کر دیے گئے فریضہ ادا ہو گیا۔ علیؑ کی حقانیت کو

دُنیا نے تسلیم کر لیا۔ اصلی اور نقلی ظاہر ہو کر رہے۔ ان جنگوں میں علیؑ کی حقانیت اتنی طاقتور شکل میں ظاہر ہوئی کہ لوگوں کو مخالفین علیؑ کے لئے خطاء اجتہادی کی تاویل کرنی پڑی۔ لیکن قابل لحاظ بات یہ ہے کہ خطاء اجتہادی بس انھیں جنگوں تک آئی ہے۔ اور جہاں جہاں تک خطاء اجتہادی کی تاویل ہے وہاں وہاں تک حدیث رسولؐ یہ بتا رہی ہے کہ کیا حق ہے کیا باطل، دوزخ کدھر ہے جنت کدھر ہے۔ کیا شرم کا مقام پوری ملت اسلامیہ کے لئے نہیں کہ رسولؐ یہ فرماتے ہیں کہ عمارؓ تمھارا مخالف تم کو دوزخ کی دعوت دے گا اور مسلمان اس کے بارے میں خطاء اجتہادی کی تاویل کرتا ہے۔ یعنی رسولؐ کا ارشاد کچھ ہے مسلمانوں کا خیال کچھ اور۔

صفینؑ کے مرحلہ تک ابہام تھا اس لئے یہاں تک حدیث رسولؐ واضح طور پر علیؑ کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اور یہیں تک خطاء اجتہادی کی تاویل بھی ہے۔ اس لئے یہیں تک حدیث رسولؐ یہ بتا رہی ہے کہ اسے خطاء اجتہادی کہنا بھی تمھاری خطا ہے۔ اور رسولؐ کی رائے پر اپنی رائے کو مقدم کرنے کی سعی ناکام ہے۔

اس کے بعد بھی بہت سے واقعات ہوئے۔ صلح امام حسنؑ ہے کربلا کی خوں ریز داستان ہے۔ امیر شام نے صفین کے بعد بھی بہ خیال خود کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ جناب حجر بن عدیؓ اور ان کے اصحابؓ کی شہادت انھیں کا کارنامہ ہے۔ زیاد کو اپنا حقیقی بھائی بنا کر اپنی قوت بازو میں اضافہ کرنا انھیں سے ممکن بنا۔ صلح امام حسنؑ

کے بعد صلح کی ہر دفعہ کو پامال کرنے کی ہمت انھیں میں تھی۔ یزید کو یہ جبر ولیعہد بنانے کی جرأت ان کے سوا کون کر سکتا تھا۔ امام حسنؑ کی شہادت پر نعرۂ تکبیر بلند کرنے کی بات ان کے سوا کون سوچ سکتا تھا اسلام میں پہلا سر جو نیزہ پر بلند ہوا وہ صحابی رسولؐ عمر بن حمق خزاعیؓ کا تھا۔ یہ انھیں کے عہد کے زریں کارنامے ہیں لیکن ان میں سے کسی کے لئے بھی زرخرید مورخین و محدثین کو امیر شام کے لئے اور یزید کے لئے خطاء اجتہادی کی تاویل کرنے کی ہمت نہ پڑی، اس لئے کہ اب حقانیت ہر شک و شبہہ سے بالاتر ہو چکی تھی۔ جہاں تک ابہام کے امکانات تھے اور خطاء اجتہادی کی تاویل کی گنجائش تھی وہاں تک حدیث رسولؐ واضح الفاظ میں اعلان حق کر رہی تھی۔

جنگ صفین کے بعد حق کے ساتھی خواہ کتنے ہی کم کیوں نہ رہے ہوں لیکن قلت تعداد کے باوجود حق و باطل کے بارے میں اب کوئی شبہہ نہیں رہ گیا تھا۔ اب جن جن معرکوں میں مسلمانوں نے اصحاب رسولؐ کے بارے میں خطاء اجتہادی کی تاویل کی ہے جب وہاں نگاہ رسالتؐ میں ان اصحاب رسولؐ کا طرز عمل جو حضرت علیؑ کے خلاف تھے باطل اور خلاف حق تھا تو پھر جہاں جہاں خطاء اجتہادی کی تاویل کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی اس کے باطل ہونے میں کسی مسلمان کو کیسے شک و شبہہ ہو سکتا ہے، اور اس کے بعد بھی کوئی سعی ناکام یزید یا امیر شام کی صفائی کی کی جائے تو اس کا اسلام اور رسول اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ آج واقعات کربلا کے سلسلہ میں اس طرح کی سعی ناکام برابر

جاری ہے۔ لیکن مقام غور ہے کہ خود یزید نے اپنی جو صفائی پیش کی ہے اس سے خود حسین مظلومؑ کی حقانیت کا بول بالا ہوتا ہے۔ یزید نے جب یہ کہا کہ "خدا غارت کرے ابن مرجانہ کو اس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا" تو گویا اس نے یہ تسلیم کرلیا کہ حق کا فیصلہ حسینؑ کے حق میں ہو چکا ہے اس ذمہ داری کا اپنے سر نہ لینا اور وہ بھی دین کے معاملات میں برسر باطل ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ ابن زیاد اس ذلت کا ذمہ دار یزید کو قرار دے رہا تھا یزید ابن زیاد کو۔ حالانکہ دنیا والے اور عقبیٰ والے دونوں ہی کو مجرم سمجھتے ہیں۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ احادیث رسولؐ نے مسلمانوں کے اس نظریہ اور عقیدہ کی پوری طرح تردید کردی ہے کہ جنگ جمل اور جنگ صفین و نہروان میں دونوں حق پر تھے۔ اب اگر مسلمان اس رائے سے ہٹ کر کچھ اور سوچتے ہیں تو ان کی یہ رائے اسلام اور رسول اسلامؐ کی رائے سے ہٹ کر ہوگی جس کا حق اس کو اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک وہ اپنے کو دائرہ اسلام میں سمجھتا رہے گا۔

چھٹی حدیث

ارشاد حضرت ختم الانبیاءؐ "علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ ہے جدھر علیؑ گردش کرتے ہیں حق ادھر گردش کرتا ہے۔"

اس حدیث میں امیرالمومنین علی ابن ابیطالبؑ کی زندگی کے کسی دور کا استثناء نہیں ہے جس میں وہ حق سے جدا ہوئے ہوں اور

حق کے کسی عہد کا استثناء ہے کہ وہ علیؑ سے جدا ہوا ہو۔ حالانکہ سرورِ عالمؐ کے فرائضِ منصبی کا یہ تقاضا تھا کہ اگر کوئی استثنا ہوتا تو وہ اسے ضرور ذکر فرماتے، خود انھیں علیؑ کے بارے میں آپؐ نے حدیث منزلت میں استثناء کیا ہے۔ سرداریٔ جوانانِ اہلِ جنت کی حدیث میں حضرت علیؑ کا استثناء ہوا ہے تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اس حدیث میں بھی کچھ دیر کے لیے سہی لیکن علیؑ کی زندگی کے کسی حصہ کو مستثنیٰ کر دیا جاتا یا حق کو علیؑ کی زندگی کے کسی پہلو سے علیحدہ کر دیا جاتا میرا یہ یقین ہے کہ اگر علیؑ و حق کی جدائی زندگی کے کسی لمحہ میں ہوتی تو رسولِ اکرمؐ اس زندگی کو ضرور اس حدیث میں بیان کر دیتے یا پھر یہ حدیث ارشاد ہی نہ فرماتے، اور جب کوئی استثنیٰ نہیں ہے تو پھر عقلِ سلیم یہ تسلیم کرے گی کہ اس حدیث کی روشنی میں عہدِ طفلی سے لے کر مسجد کوفہ میں شہادت تک کی زندگی شامل ہے۔ اور اس پورے دور میں نہ صرف یہ کہ علیؑ حق کے ساتھ رہے بلکہ حق بھی علیؑ کے ساتھ رہا۔ اور نہ صرف یہ کہ حق علیؑ کے ساتھ رہا بلکہ جدھر علیؑ گردش کرتے تھے حق ادھر گردش کرتا تھا یعنی حق تابعِ علیؑ تھا۔

اب تاریخ پر نگاہ ڈالیے۔ تاریخ یہ کہتی ہے کہ بعثت کے بعد اسلام لائے۔ تو کیا قبلِ بعثت کی زندگی خلافِ حق تھی اگر تھی تو حدیث غلط ورنہ نہیں تھی اور یقیناً یہی صحیح بھی ہے تو تاریخ غلط۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ اسلام لائے کی لفظ تاریخ نے غلط لکھی ہے بعثت کے بعد اظہارِ اسلام کیا۔

یعنی "جدھر حق گردش کرتا ہے ادھر علیؑ گردش کرتے ہیں" یہ ہوتا کہ ناطق صامت کا پابند ہوتا۔ دوسری صورت میں "جدھر علیؑ گردش کرتے ہیں ادھر حق گردش کرتا ہے" صامت ناطق کا پیرو ہو گیا اب افضلیت ناطق کو ہے۔ صامت کو نہیں۔ حدیث ثقلین میں رسول اکرمؐ نے دو چیزیں چھوڑی تھیں۔ ایک صامت ایک ناطق اس حدیث کی روشنی میں اب امت یہ فیصلہ کرے کہ کون آگے ہے اور کون اس کے بعد۔ قرآن عین حق ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو اسلام ختم ہوا اور اگر عین حق ہے تو پھر اس حدیث کی روشنی میں قرآن کو نیزوں پر بلند نہ دیکھئے بلکہ علیؑ کے ساتھ دیکھئے۔ علیؑ کے گلے میں حمائل دیکھئے۔ اور اگر نہ دکھائی دے تو صرف علیؑ کو دیکھئے۔

قرآن ہر حال میں انھیں کے ساتھ ہو گا۔ اس لئے کہ حق تابع علیؑ ہے۔ علیؑ کو تابع نہیں کہا گیا ہے۔ یہ حدیث علیؑ کے بارے میں ہر اس تصور کی نفی کرتی ہے جو علیؑ کو ان کے مرتبے سے بڑھائے یا کم کرے۔ یا جو قرآن کو اہلبیتؑ پر فضیلت دے۔ دونوں کا مرتبہ بلند سے بلند تر ہے ناطق کو فضیلت اس لئے ہوتی ہے کہ صامت بذات خود راہِ حق کی نشاندہی کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ اس لیئے کہ اگر صرف صامت ہو گا تو لوگ اس کے بارے میں اپنے اپنے مطلب کے مطابق تاویل کریں گے اور دعویٰ یہی کریں گے کہ بس حق یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ صامت یہ نہیں کہہ سکتا کہ کہنے والے کا بیان غلط ہے اس لئے باطل پرست بھی اپنے کو

حق پر کہے گا اور حق والا تو حق ہی پر ہوگا لیکن اگر صامت کے ساتھ ناطق بھی ہے تو ناطق کا عمل راہِ حق کے لیے نشانِ منزل کا کام دیگا اور وہ لوگوں کی غلطیوں کی بھی نشاندہی کرتا رہے گا اس طرح غلط افراد خاموش رہنے والے حق کو اپنی منشاء کے مطابق نہ استعمال کرسکیں گے اسی لیے اس حدیث میں سرورِ عالم نے حق کو تابع علیؑ بتایا، علیؑ کو تابع حق نہ ارشاد فرمایا اس لیے کہ علیؑ اگر تابع حق ہوتے تو علیؑ کے دور میں بھی اور ان کے بعد بھی وہ لوگ جو علیؑ سے اختلاف رکھتے تھے وہ بھی اپنے کو حق ہی پر کہتے اور اس عمل کی مختلف تاویل کر دیتے۔ اگر کوئی تاویل اس عہد میں ممکن نہ بھی ہوتی تو ان افراد کے بعد ان کے تابع اور پیرو ان لوگوں کی صفائی میں خطاءِ اجتہادی کی تاویل کرکے ان کی خلاف حق سیرت کو حق ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن جب سرورِ عالم نے حق کو تابع علیؑ فرما دیا تو اب ہر وہ تاویل جو علیؑ کے مخالفین کی جانب سے اپنے عمل کی تائید میں کی جائے گی وہ کلام رسالتؐ کی تکذیب کے سوا اور کچھ نہ ہو سکے گی۔ کلام بلاغت نظام پیغمبرؐ کے مطابق حق علیؑ کے ساتھ ہے اور تابع علیؑ بھی ہے اس لیے علیؑ سے علیحدہ رہ کر حق کی تلاش لاحاصل کے حدود سے کبھی آگے نہ بڑھے گی۔ اب خواہ علیؑ کا دور ہو اور اس دور کے لوگ ہوں یا علیؑ کے بعد کا دور ہو تلاش حق میں ہر دور کے لوگوں کے لیے رسول اکرمؐ کے بعد علیؑ کو دیکھنا ہے اور ان کی سیرت پر نظر رکھ کر آگے بڑھنا ہے۔

مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے صحابہ یقیناً حق پر تھے اس تعداد میں اختلاف ہے کہ کتنے حق پر تھے اور کتنے نہیں لیکن پھر بھی بہت سے صحابی ایسے ہیں جو بلا کسی اختلاف کے حق ہی پر تھے۔ حضرت علیؑ کے ساتھ ساتھ حضرات حسنین علیہم السّلام بھی تو حق ہی پر تھے لیکن ارشاد رسالتؐ حضرت علیؑ کے لئے ہوا کہ وہ حق کے ساتھ ہیں اور حق ان کے ساتھ۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی آسان ہے کہ رسول اکرمؐ نے حضرت حضرت علیؑ کے بارے میں اس حدیث کو ارشاد فرما کر اپنے بعد کے ہونے والے خلا کو پُر کر دیا تھا۔ اس لئے کہ ذات رسالتؐ کے بعد بہت سی شخصیتیں ایسی ہو سکتی تھیں، جو علیؑ سے برنام اسلام اختلاف کر سکتی تھیں اور چونکہ ظاہری حیثیت سے ہر ایک رسولؐ کے قریب رہ چکا، اس لئے عوام اور خواص دونوں کے لئے اختلافات کی صورت میں یہ الجھنیں ہو سکتی تھیں کہ حق کس کے ساتھ ہے لیکن اس ارشاد رسالتؐ کے بعد سمجھنے والے ذہن کے لئے حق کا راستہ بالکل صاف ہے اس لئے کہ حق پر بہت سے صحابہ ہو سکتے ہیں لیکن ملّت میں علیؑ کے سوا اور کوئی ذات ایسی نہ تھی جس کے پیچھے حق گردش کرتا ہو۔ حق جس کا تابع ہوگا اس سے غلطی کا امکان نہ ہوگا اور رسولؐ کے بعد ایسی ہی شخصیت کی ضرورت تھی جس سے غلطی کا امکان کسی حال میں نہ ہو۔

اگر امّت رسول اکرمؐ کے بعد علیؑ کا انتخاب متفقہ طور پر کر لیتی تو پھر راہ حق کا تعین بلا اختلاف ہو جاتا۔ اور امیرالمومنینؑ اپنے بعد کے

نائب کا اعلان بتا ہی دیتے اور اس طرح یہ سلسلہ رشد و ہدایت بلا اختلاف
قائم رہ کر مسلمانوں کی رہنمائی کرتا رہتا۔ لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی سے
جو ہونا چاہیئے تھا وہ نہ ہوا، اور جو نہ ہونا چاہیئے تھا وہ ہو کر رہا۔

بدیہی بات یہ ہے کہ اگر علیؑ کی ذات کے ساتھ اسلام کے مفاد
نہیں وابستہ تھے یا بہت کم وابستہ تھے تو پھر رسول اکرمؐ نے اتنے اصرار کے
ساتھ علیؑ کے بارے میں کیوں احادیث ارشاد فرمائیں۔ اگر بعد رسولؐ
اسلام میں ان کا کوئی اہم ترین مقام نہ تھا تو سرور عالمؐ کو خاموش
رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن اپنی تمام تر مصروفیتوں کے باوجود حضور
اقدسؐ بار بار علیؑ کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتے رہے۔ اور ہر فرمان جب
علیؑ کا رابطہ اسلام سے یا علم سے یا ہدایت سے یا اپنے بعد کی سرداری
سے ضرور قائم رکھا۔ غدیر خم میں کتنا وقت صرف ہوا۔ حدیث طیر میں
میں کتنی مدت صرف ہوئی۔ بیشتر مواقع پر صرف علیؑ سے تخلیہ کرنے
کے لیئے کتنا وقت صرف فرمایا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے منازل
ایسے ہیں جہاں علیؑ و رسالتؐ کے تعلقات منفرد نظر آتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ آیا ان تمام باتوں کا کوئی مقصد تھا یا معاذ اللہ
یہ صرف تضیع اوقات کی جا رہی تھی۔ مسلمانوں کو اختیار ہے کہ وہ
جو چاہیں سمجھیں۔ لیکن رسول اکرمؐ اپنے عمل سے اپنے بعد کے لیئے
علیؑ کو ایک منفرد حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ مسلمانوں کو
رسولؐ کے بعد کوئی دشواری نہ ہو۔ اگرچہ نتائج نے یہ بتا دیا کہ وہ دشواری
مسلمانوں کا نصیب بن چکی تھی۔ لیکن رسول اکرمؐ نے اپنا فریضہ تبلیغ

تو ادا کر دیا حجت تو تمام کر دی۔ آج مسلمان بڑی سادگی اور بھولے پن میں یہ کہہ دیتا ہے کہ سب کے سب صحابی رسولؐ تھے سب کے مرتبے بلند تھے، ہم جیسے لوگ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کون صحیح تھا کون غلط تھا ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ سب حق پر تھے۔ لیکن ماضی کی تاریخ ہے خداوند عالم کی قائم کردہ یہی نظیر دیکھنی تھی جس سے رائے قائم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ قرآن میں تمام ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا کے واقعات نہیں بیان کئے گئے ہیں۔ صرف خاص خاص واقعات کو کہیں اجمال کہیں تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ ان واقعات کے بیان کرنے کا ایک واضح مقصد یہ بھی ہے کہ اس کی داستان سے حال و مستقبل کے لوگ سبق لے سکیں اور اصلاح کریں۔ مذہب کی دنیا میں رشتہ داریوں اور نسب کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی صرف کردار پر زور دیا گیا ہے قدرت کے پیش نظر اگر رشتہ داریاں اور نسب کے تعلقات ہوتے تو قابیل کے کارناموں کو قرآن میں اس طرح نہ پیش کیا گیا ہوتا برادران یوسفؑ کے واقعات اتنی تفصیل سے نہ پیش کئے جاتے ازواج جناب نوحؑ و لوطؑ کے واقعات کی پردہ پوشی کی جاتی۔

ان واقعات کی درج قرآن نظیروں کے بعد کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم کیا اظہار خیال کر سکتے ہیں وہ دونوں ازواج پیغمبر ہیں۔ اس لئے ہم خاموش رہیں گے یا خدا جانے ہمارے نزدیک تو انبیاء کے ازواج ہیں۔ بس ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کیا حق ہے

کیا نا حق ہے اور جب ہم کو حق اور ناحق معلوم ہو جائے تو بس ہمیں شخصیت اور رشتے کو نہیں دیکھنا ہے، حق کی نشاندہی کا ذریعہ کوئی بھی ہو لیکن وہ ذریعہ رسولؐ سے بڑھ کر معتبر نہیں ہو سکتا۔ جب سرورِ عالمؐ نے حق کی نشاندہی یہ فرما کر کر دی کہ "علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ رہے جدھر علیؑ گردش کرتے ہیں ادھر حق گردش کرتا ہے" تو اب اس ارشادِ نبویؐ کے بعد شخصیت اور رشتے داری و تعلقات کو نہیں دیکھنا ہے صرف علیؑ کو دیکھنا ہے کہ وہ کدھر ہیں۔ بس جدھر علیؑ ہوں گے حق کی گردش اسی سمت ہو گی۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ سب صحابی حق کے ساتھ تھے لیکن کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حق بھی سب کے ساتھ تھا۔ ہر حال میں حق اگر کسی کے ساتھ رہا تو وہ ذاتِ اقدس علی ابن ابی طالبؑ کی تھی۔ اس لیے منزلِ امتحان جب آئیگی تو اصحاب کے طرزِ عمل سے زیادہ علیؑ کے طرزِ عمل پر نگاہ رکھنے میں ہی نجات ہو گی۔ اور جب علیؑ کے ذریعہ حق کا یقین ہو گیا تو پھر خطاءِ اجتہادی کی تاویل افراد سے محبت کا مظاہرہ تو بن سکتی ہے لیکن حق سے محبت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

ساتویں حدیث

عید کا موقع ہے۔ مدینہ کے رہنے والے نمازِ عید کے لئے بیرونِ شہر جا رہے ہیں۔ سرورِ عالمؐ بھی تیار ہیں۔ آپ کے دونوں کمسن نواسے بھی ناناؐ کے ہمراہ چلنے پر کمربستہ ہیں۔ بچے اپنے ناناؐ سے یہ کہتے ہیں کہ

"نانا اصحاب کے بچے اپنے ناقوں پر جا رہے ہیں ہمارے لئے بھی ناقے کا انتظام کیا جائے" عالی مرتبت نانا۔ بچوں کی اس خواہش کو اس طرح پورا کرتا ہے کہ اپنے دونوں کاندھوں پر دونوں کو بٹھا لیتا ہے۔ بچے ناقہ کے تصور میں مہار ناقہ کا مطالبہ کرتے ہیں، نانا اپنی زلفوں کو ان کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ بچے ناقے جیسی آواز کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ نانا اپنے دہن مبارک سے ناقوں جیسی آواز نکالتے ہیں، اکابر صحابہ (مہاجرین و انصار) اس منظر کے نہ صرف یہ کہ تماشائی ہیں بلکہ ساتھ ساتھ عید گاہ کی طرف چل رہے ہیں۔ عالم اسلام کے ایک ممتاز صحابی (غالباً حضرت ابو بکر یا حضرت عمر) نے جب یہ رائے ظاہر کی کہ کتنا اچھا مرکب ہے تو سرور عالم نے ان صحابی کی طرف چیں بہ جبیں ہو کر دیکھا اور زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری فرمائے کہ "تم نے یہ بھی کیوں نہ کہا کہ راکب بھی کتنے اچھے ہیں۔"

یہ ہے پورا واقعہ۔ جو میں نے علم و حقین کے ماتحت مختصر طور پر اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ الفاظ بدل سکتے ہیں لیکن واقعہ اسی قدر ہے۔ جس واقعہ کے سلسلہ میں آنحضرت نے یہ حدیث ارشاد فرمائی وہ زبان زد خاص و عام ہے۔ حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال نے اپنی شہرہ آفاق نادری نظم میں اس واقعہ کو ذیل کے شعر میں یوں پیش کیا ہے ؎

مہر آں شہزادہ خیر الملل ☆ دوش ختم المرسلین نعم الجمل

آئیے اس حدیث کے مضمرات پر نگاہ ڈالیں اور فرمان رسالت کے

رموز و اسرار پر حتی الامکان غور کریں۔

سرورِ عالمؐ کی پوری عمر مبارک ۶۳ سال ہے۔ ۴۰ سال قبل بعثت۔ ۲۳ سال بعد بعثت۔ اس ۲۳ سال میں ۱۳ سال مکّہ کی پرآشوب زندگی اور ۱۰ سال مدینہ میں مکّہ کے مقابل میں نسبتاً پُرسکون ماحول جس دین و شریعت کو قیامت تک باقی رہنا تھا اور جس کے بعد سلسلۂ نبوت ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہا تھا اس دین و شریعت کی تبلیغ کے لئے مشیت ایزدی نے صرف ۲۳ سال کی مدّت رکھی، حالانکہ اس کے قبل کے انبیاء کرامؑ کی عمریں خاصی طویل ہوا کی ہیں۔ جناب نوحؑ ۹۰۰ برس تک اپنا فریضۂ تبلیغ ادا فرماتے رہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں ایک نبی کے بعد دوسرا نبی آتا اور تبلیغ کے فرائض کو سنبھال لیتا ہے۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ احکامات بھی برابر بدلتے رہتے ہیں۔ کسی زمانہ میں کوئی شریعت کسی زمانہ میں کوئی شریعت۔ انبیاء کرامؑ کی عمریں کافی طویل لیکن عمر شریعت قلیل۔ لیکن خالق کو سردار کائناتؐ کی تبلیغ پر اتنا بھروسا اور اعتماد کہ ظاہری عمر نبوت صرف ۲۳ سال اور عمر شریعت کا دامن حیات سے بندھا ہوا۔ وقت بہت کم اور کام بہت زیادہ۔ اب اسی ۲۳ سال میں ہادیٔ عالمؐ کو وہ سب کچھ کر دینا ہے اور کہہ دینا ہے کہ جس کے اجمال میں قیامت تک کے مسائل کی تفصیل مضمر ہو۔ اسی ۲۳ سال میں ابتدائی ۱۳ سال مکّہ میں اس طرح گزرے کہ بعثت کے بعد ۳ سال کی خاموش زندگی بھی ہے۔ اسی میں اعلان کے بعد ۳ سال کی شعب ابی طالب کی قید بھی ہے اور سات سال کی پُر از اضطراب زندگی بھی ہے پھر مدینہ کی دس سال کی نسبتاً پُرسکون زندگی ہے۔ غرضیکہ

اسی ۲۳ سال میں سب کچھ ہے صلح بھی ہے جنگ بھی رات بھی شامل ہے دن بھی۔ نمازیں بھی شامل ہیں اور دوسری عبادتیں بھی۔ اب ذہن انسانی ارتقاء کی جتنی بھی منزلیں طے کرے اسے اسی ۲۳ برس کے اجمال میں ارتقاء انسانیت کے سارے تفصیلات مل جائیں گے۔ یہ ۲۳ سال ان مسلمانوں کے لئے خاص طور سے بیحد اہم ہیں جو بعد رسولؐ کسی معصوم سلسلہ رشد و ہدایت کے قائل نہیں ہیں۔ اب انھیں حیات رسالتؐ ہی سے سب کچھ حاصل کرنا ہے۔ تو اب یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرور عالمؐ کا ہر لمحہ بڑا ہی قیمتی تھا۔ عام افتاد طبع کے مطابق ۲۳ سال میں ۱/۳ زندگی راحت و آرام میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ رسول اکرمؐ نہ بھی سوتے رہے ہوں۔ اسلئے کہ اگر سوتے ہوتے تو قرآن مجید یہ کیوں کہتا کہ "راتوں کو کم حالت قیام میں رہا کیجئے" لیکن وہ مسلمان جو حضورؐ سے کسب فیض کرتا تھا۔ وہ تو آرام کرتا تھا کھاتا پیتا تھا۔ کسب معاش کی فکر میں رہتا تھا۔ اس کے ماسوا قبول اسلام کی رفتار بھی رسول اکرمؐ سے کسب فیض میں ایک رکاوٹ تھی کوئی ابتداء میں اسلام لایا کوئی انتہا میں۔ صلاحیت ذہنی کا مسئلہ تو ان سب سے علیحدہ ہے اس پس منظر میں یہ ضروری تھا کہ رسول اکرمؐ کم سے کم وقت میں مسلمانوں کو سب کچھ بتا دینے کی فکر فرماتے لیکن رسولؐ کا عمل بظاہر اس کے برعکس معلوم ہوتا ہے۔ رسولؐ سجدہ میں ہیں اور حسینؑ پشت مبارک پر۔ حسینؑ کے اس عمل کی وجہ سے سرور عالمؐ کی زبان مبارک پر ستر مرتبہ تسبیح کے الفاظ جاری ہوتے رہے۔ اگر حسینؑ پشت مبارک پر نہ ہوتے تو یہ الفاظ صرف تین چار

ہی مرتبہ ادا کیئے جاتے، ایسی صورت میں ۲۷ بار کا اضافہ ہوا۔ کتنی دیر میں یہ الفاظ زبانِ مبارک سے جاری ہوئے اس کا اندازہ آج کی دنیا میں لگانا کچھ دشوار نہیں ہے۔ اب ملّتِ اسلامیہ یہ فیصلہ کرے کہ آیا یہ محبّت اولاد میں تبلیغ و ہدایت کے قیمتی اوقات معاذ اللہ برباد کیئے جا رہے ہیں یا کسی اہم بات کی تبلیغ فرمائی جا رہی ہے اور عبادت میں مزید عبادت شامل کی جا رہی ہے۔ یہ محبّت ذاتی ہے یا سجدہ میں اللہ سے لو لگی ہوئی ہے۔ سجدہ میں جو وقت حسینؑ کی وجہ سے زیادہ صرف ہوا وہ بعد نماز خطبہ و موعظہ میں اگر صرف ہوتا تو یقیناً ہر مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوتا۔ اور اسی طرح کے بہت سے مواقع ہیں۔ ماننا پڑے گا یہ بھی ایک اندازِ تبلیغ تھا۔ رسولؐ مستقبل کے رہنماؤں سے مختلف انداز میں عبادت کے مخصوص حالات میں تعارف کرا رہے تھے۔ عبادت کے کتنے طریقے ہیں اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تبلیغ کے کتنے انداز ہیں اسے جاننے کی ضرورت ہے۔ اسی کو نہ سمجھ کر اور جان کر مسلمان گمراہ ہو گیا۔ اس تمہید کے بعد آئیے اس واقعہ پر نگاہ ڈالیے جس کے سلسلہ میں یہ حدیث مذکورہ ارشاد ہوئی ہے۔ نماز عید کی جگہ تک جانے کے لیئے رسولؐ نے سواری کا مطالبہ کیا تھا۔ ناقہ کی فرمائش کی تھی۔ دوش کے لیئے نہیں درخواست کی تھی۔ رسولِ اکرمؐ نے ناقہ کی موجودگی کے باوجود اپنے دوشِ مبارک کی خود پیشکش کی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہنِ رسالت کسی خصوصی اہتمام کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ ناقہ عمومی حیثیت رکھتا ہے ایسی سواری جو سب کے لئے جاذبِ توجہ ہو۔ اور پوری تاریخ میں اپنی ندرت کو باقی

رکھے۔ اور جس کے دُور رس نتائج ہوں۔ ناقہ جتنی دیر میں منزل تک پہونچتا رسول مقبولؐ اپنے دوش پر بچّوں کو بٹھا کر اتنی دیر میں نہیں پہونچ سکتے تھے۔ یہ وقت کے ضائع ہونے کی بات ہے۔ لیکن وقت کی قیمت سے ان بچّوں کی قدر وقیمت کو مسلمانوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں۔ صحابہ رضؓ ساتھ ساتھ ہیں لیکن کسی نے اخلاقاً بھی یہ نہ کہا کہ دو میں سے ایک صاحبزادے کو تو ہمیں دے دیجیے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ خود یہ محسوس فرما رہے تھے کہ یہ عالم اور ہے۔ یہ بشریت کے تقاضے نہیں ہیں، یہ تبلیغ وہدایت کی خصوصی منزل ہے۔ اس بار کو رسولؐ کے سوا اور کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ ان بچّوں کے عالی مرتبت باپ کی اس موقع پر خاموشی یہ صاف بتا رہی ہے کہ یہ صرف فرائضِ نبوت ادا ہو رہے ہیں کوئی بھی کارِ رسالت میں دخل نہیں دے سکتا۔ مہاجر والنصار و بنی ہاشمؑ کے جھرمٹ یا ہجوم میں رسول اکرمؐ نماز عید کیلئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ عید گاہ میں ہزارہا نمازی اس منظر کو دیکھتے ہیں بچّے دوشِ رسولؐ پر بظاہر ناقہ کا تصوّر کئے ہیں۔ مہارِ ناقہ کی فرمائش اور ناقہ جیسی آواز کے سننے کی خواہش اور رسولؐ ہر ایک تمنا کو پورا کرتے ہیں۔ اب دُنیا بتلائے کہ یہ نواسے کی محبّت ہے یا رہنما کا تعارف، اگر نواسے کی محبّت تھی تو اس کے بعد یا اسی وقت اکابر صحابہ نے ناقوں سے اپنے بچّوں کو اتار کر کیوں نہ سنّت رسولؐ پر عمل کرتے ہوئے اپنے دوش پر بٹھا لیا۔ اس وقت موقع نہ تھا تو بعد میں اس سنت رسولؐ پر عمل کیا جاتا۔ لیکن ایسا کبھی نہ کرنا یہ بتاتا ہے کہ رسولؐ کا یہ عمل مخصوص

افراد کے لئے اور مخصوص مقصد کے لئے تھا اور وہ مقاصد کسی اور ذات کے ساتھ نہیں وابستہ کیئے جا سکتے تھے۔ جب رسولؐ اسی عالم خاص میں آگے بڑھ رہے تھے تو ایک نمایاں صحابی کی زبان سے آواز نکلی کہ "کتنا اچھا مرکب ہے" یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ کہنے والے صحابی کی تعریف باعتبار سواری نہ تھی بلکہ باعتبار کردار و عظمت پیغمبرؐ تھی۔ کہنے والے نے جو کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔ رسول اللہؐ کی جو تعریف اس وقت کے ماحول میں ان کے ذہن میں آئی وہ زبان پر آ گئی اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ کہنے والا واقعات کے تمام رخ کو بیان بھی کر دے اس مجمع میں سب سے زیادہ اہم ذات رسالت تھی اس کی تعریف کر دی پھر صاحب خلق عظیم پیغمبرؐ کی پیشانی مبارک پر شکن کیوں پیدا ہوئی اور کیوں آپ نے اعتراض فرمایا۔ مجھے تو صرف یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبرؐ کا اس وقت کا عمل اپنے تعارف کے لئے نہ تھا اپنے نواسوں کی معرفت کرانا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے اس مجمع میں مراد رسول یہ تھی انھیں پہچان لو، انھیں سے اسلام کا مستقبل وابستہ ہے۔ شرف رسولؐ کی تعریف سے مقصد پیغمبرؐ نظر انداز ہو رہا تھا اس لئے ہادی اعظمؐ نے اپنے صحابی کو ٹوک کر اپنے مقصد کی وضاحت بھی کر دی "یہ بھی تو کہو کہ راکب کتنے اچھے ہیں" رسولؐ کی سیرت واضح طور سے مسلمانوں سے یہ کہہ رہی ہے کہ تم صرف پیغمبرؐ کی تعریف کرتے رہو اور اہلبیت پیغمبرؐ کو نظر انداز کرتے رہو تو یہ بات خوشنودی مزاج پیغمبرؐ کا باعث نہیں بن سکتی۔ خواہ تمھاری نیت کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہو۔ یہ ہے اس واقعہ کا ایک رخ، اب دوسرا

رخ ملاحظہ ہو۔ اگر وہ صحابی یہ نہ فرماتے کہ کتنا اچھا مرکب ہے بلکہ صرف یہ کہتے کہ کتنے اچھے راکب ہیں تو کیا حضورؐ خفا ہوتے اور آپ کو ٹوک دیتے۔ اور یہ نہ فرماتے کہ تم نے مرکب کی تعریف کیوں نہ کی۔ ماننا پڑے گا کہ ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ اس لئے کہ یہ تعریف مقصد رسالتؐ کے مطابق ہوتی ایسی صورت میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہلبیت رسولؐ کی تعریف کیجئے اور رسولؐ کی تعریف نہ کیجئے تب بھی خوشنودی مزاج رسالتؐ بہرحال حاصل رہے گی اس لئے کہ رسولؐ کے اہلبیتؑ کی تعریف یا معرفت بغیر رسولؐ کی معرفت کے ہو ہی نہیں سکتی۔ اہلبیتؑ کی عظمت کا اعتراف گویا خود رسولؐ کی عظمت کا اعتراف ہے۔ قول رسولؐ۔ عمل رسولؐ۔ اور تقریر رسولؐ یہ سب سنت رسولؐ ہیں۔ اس ایک واقعہ میں قول رسولؐ اور عمل رسولؐ دونوں کا مظاہرہ اہلبیتؑ کے لئے ہے۔ اب مسلمانوں کے عقائد و نظریات اہلبیت رسولؐ کے لئے جو کچھ بھی ہوں وہ صرف رسول اکرمؐ ہی سے محبت کو کافی سمجھے ہوں۔ اور اہلبیت رسولؐ کو مسلسل نظرانداز کرتے رہیں اس کے تو وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ لیکن سیرت رسولؐ مسلمانوں کے عقائد اور نظریات کی اصلاح کر رہی ہے اور گویا مسلمانوں سے یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے جسے اپنے دوش پر جگہ دی ہے اسے تم زمین پر نہ گرانا۔ بلکہ اپنے دل میں جگہ دینا۔ کاش مسلمان اس سنت پیغمبرؐ پر عمل کر سکتا۔

باسورتھ اسمتھ ایک انگریز مورخ سرور عالمؐ کے کارناموں کا خلاصہ یوں بیان کرتا ہے کہ "محمدؐ دنیا میں وہ اکیلے انسان ہیں جنھوں نے بیک وقت ایک قوم کی بنیاد ڈالی، ایک مذہب کی بنا کی اور ایک

حکومت کو قائم کیا" قوم سے اسکی مراد متفرق اور پراگندہ عربوں کو متحد کر کے قبیلہ پرستی کو ختم کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ بلاشبہ یہ تینوں چیزیں اس آپ کے کردار سے بیک وقت ظاہر ہوئیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں سے مقصود رسالت کیا تھا۔ یہ تو عمل کے نتائج ہیں۔ ماننا پڑے گا کہ مقصود پیغمبرؐ ان میں سے صرف دین تھا اور دین کے استحکام کے نتیجہ میں باقی چیزیں ضمنی یا ثانوی طور پر یا قہری طور پر خودبخود پیدا ہو گئیں وہ صرف عربوں کے اتحاد کے لئے اس دنیا میں نہ آئے تھے بلکہ پوری دنیا کا اتحاد ان کے پیش نظر تھا۔ اس لئے کہ وہ صرف عربوں کے رسولؐ نہ تھے بلکہ پوری دنیا کے رسولؐ تھے۔ ان کے پاس وقت بہت کم تھا اس لئے ان کے عہد سعادت تک اسلام صرف عرب تک محدود رہا اس لئے صرف عربوں میں اتحاد پیدا ہوا۔ ان کے بعد اگر اسلام کی ترویج انھیں کے خیالات کے مطابق ہوتی تو پوری دنیا نہ صرف یہ کہ مسلمان ہوتی بلکہ متحد بھی ہوتی۔ جہاں جہاں اسلام حقیقی کی روشنی پہونچی وہاں وہاں کے لوگ خودبخود حکومت اسلامی کی بنا ڈالتے جاتے۔ اس طرح ضمنی طور پر حکومت کی بھی بنیاد قائم ہو جاتی۔ لیکن حکومت اور صرف حکومت مقصود رسالتؐ کبھی بھی نہ تھا۔ اگر حکومت مقصود رسالت ہوتی تو آپ اپنے عہد میں خزانہ اور فوج کی بنیاد ڈالتے عسکری نظام کو مستحکم کرنے کے لئے تنخواہ دار فوج مقرر فرماتے جو اپنے حدود مملکت میں نظام اسلامی کو بہ جبر یہ قائم رکھتی۔ لیکن ہادی عالمؐ دین میں جبر کے قائل نہ تھے اس لئے: فوج رکھی نہ خزانہ کی بنیاد قائم کی

حضرت ابوبکر کے عہد میں بھی کوئی نئی بات نہ ہوئی لیکن حضرت عمر کے عہد میں تنخواہ دار فوج بھی قائم ہوگئی اور بیت المال بھی۔ یعنی جو چیز اسلام کے نتیجہ میں ضمنی اور ثانوی طور پر عالم ظہور میں آئی تھیں وہ باقاعدہ قائم کردی گئیں۔ اور جسے مرکزی حیثیت حاصل تھی یعنی دین و شریعت کے تحفظ کے لئے سنت رسول کو باقی رکھنے کی کوشش اسے نظر انداز کردیا گیا بلکہ اس کے یاد رکھنے والوں پر اور اس کی تبلیغ کرنے والوں پر کوڑے برسائے گئے ان کوڑے کھانے والوں میں جناب ابوہریرہ کی شخصیت بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن اگر ہدایت کے لئے کافی ہوتا تو ایک ہی فرقہ کے چار امام چار طرح کی فقہ نہ بیان کرتے اور چار طرح نمازیں پڑھی جاتیں۔ اسلئے ہر حال میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن کے ساتھ سنت کا تحفظ بھی ضروری تھا۔ لیکن سنت رسول کے تحفظ کے بجائے نظم حکومت اور وسعت سلطنت پر زیادہ زور دیا گیا۔ حکومت تو ختم ہونے والی چیز ہے وہ ختم ہو کر رہی۔ قبیلہ پرستی پھر سے زندہ ہوگئی۔ اموی دور سلطنت کو اسلامی نہیں بلکہ عرب دور حکومت کہا جاتا ہے۔ بنی عباس کا عہد عجمیوں کے عروج کا زمانہ ہے۔ غرضیکہ رسول کا اسلام ثانوی بن کر رہ گیا تھا۔ عربوں اور عجمیوں کی حکومت کے تذکرے تاریخ میں زیادہ ہیں۔ اسلام کی حقیقی حکومت ختم ہوگئی تھی۔ اسلام کے نام پر حکومت دنیا باقی رہ گئی تھی۔ بعد کے علماء نے کاوشیں کرکے فقہ اسلامی کی ترتیب کی اور فقہ اسلامی کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔

سوال یہ ہے کہ جمہور مسلمین کی جس فقہ کی بنیاد عہد امام ابو حنیفہ میں پڑی وہ پہلی یا دوسری خلافت میں کیوں نہ مرتب کی گئی۔ نظم حکومت زیادہ ضروری تھا یا فقہ و شریعت۔ امام ابو حنیفہ بلا کسی اختلاف کے امام جعفر صادقؑ کے شاگرد ہیں۔ اس میں البتہ اختلاف ہے کہ وہ شاگرد رشید بھی تھے یا نہیں۔ انھوں نے جب معصوم امامؑ کے ہاتھوں فقہ جعفری کو منظم ہوتے دیکھ لیا تو فقہ حنفی کی بنیاد رکھی۔ امام جعفر صادقؑ کے پہلے کسی معصوم امامؑ کے لئے یہ موقع نہ تھا کہ وہ کسی فقہ کی بنیاد کو قائم کرتا۔ یہی دور ایک ایسا تھا، جس میں بنی امیہ کا زوال اور بنی عباس کے عہد حکومت کی بنا ہو رہی تھی۔ بنی عباس شہادت امام حسینؑ کے تاثرات سے فائدہ اٹھا کر تاریخ کے پردے پر نمایاں ہو رہے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ نے اس موقع کو دین محمدیؐ کو محفوظ کرنے کے لئے بہترین وقت سمجھا۔ اس کے لئے انھوں نے ایثار کیا قربانیاں دیں۔ مسلم خراسانی کی حکومت کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ حکومت چھوڑ کر شریعت کا تحفظ کیا۔ آج بنی عباس کی حکومت کے آثار ختم بھی ہو چکے ہیں لیکن فقہ جعفری قیامت تک زندہ رہے گی۔ ان کا دل عشق الٰہی سے معمور تھا اور ع

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

اس طرح سے مذکورہ بالا سطروں میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جناب رسول خدا نہ تو حکومت کے لئے آئے تھے نہ سلطنت

عربوں کو متحد کرنے کے لئے وہ جس مقصد کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ اس کی زندگی بھر تبلیغ واشاعت کرتے رہے۔ جن لوگوں کی ذات سے اس پاک مقصد کا مستقبل وابستہ تھا ان کو سربلند کرکے پیش کرتے رہے۔ خواہ وہ خم غدیر کا چٹیل میدان ہو خواہ آپ نماز عید کیلئے روانہ ہو رہے ہوں ہر جگہ بات صرف ایک ہے۔ وہاں پالان شتر کا منبر بنا کر لوگوں کی توجہ اپنی اور علیؑ کی طرف مبذول کرکے وہ کچھ کہا جس کے کہنے کے لئے یہ انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں عید کے موقع پر اپنے دوش مبارک پر نواسوں کو جگہ دے کر مسلمانوں کی توجہ کو ان کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ اور اس طرح ہر جگہ تبلیغ نبوت کے فرائض ادا کئے گئے۔ اب مسلمان اسے کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس سے کیا سبق لیتا ہے۔ یہ اس کی اپنی ذاتی ذمہ داری ہے۔

آٹھویں حدیث

ارشاد حضرت رسول اکرمؐ کہ "یہ میرا حسینؑ ہے اسے اچھی طرح پہچان لو" یہ حدیث اس وقت ارشاد فرمائی گئی جب آنحضرتؐ مسجد نبوی میں مدینہ میں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور حضرت امام حسینؑ عالم طفولیت میں اپنے گھر کے دروازہ سے نکل کر نانا جانؐ کی طرف بڑھ رہے تھے عالم یہ تھا کہ لڑکھڑاتے ہوئے، تیز قدموں سے منبر کی طرف جا رہے تھے اور رسول اکرمؐ نے یہ محسوس فرمایا کہ کہیں میرا فرزند زمین پر نہ گر جائے موعظہ منقطع فرما کر منبر سے تشریف لائے اور

حسینؑ کو گود میں اٹھا لیا اور اسی وقت یہ حدیث ارشاد فرمائی جس کا ترجمہ اوپر درج کیا گیا ہے۔ یہ ارشاد اس مجمع کے سامنے ہو رہا ہے جو نہ صرف یہ کہ سرورِ عالمؐ کو بلکہ حسینؑ کو بھی ان کے فرزند کی حیثیت سے اچھی طرح جانتا ہے۔ اس نے بارہا حسینؑ کو آغوشِ رسولؐ میں دیکھا ہو گا۔ وہ مجمع جو کہ مسلمانوں کا ہے اُس لئے اس مجمع کے لئے نہ صرف یہ کہ بہ اعتبار حقیقت بلکہ بہ اعتبار عقیدہ کے بھی یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ ہی سے نسل رسالت چلے گی ورنہ قرآن کا سورۂ کوثر غلط ہو جائے گا۔ یہ مجمع جانے پہچانے لوگوں کا ہے رسولؐ ان لوگوں کو جانتے ہیں اور یہ لوگ رسول اکرمؐ کو۔ لیکن جاننا اور ہے پہچاننا اور ہے اسی لیے حضورؐ صرف جاننے کی بات نہیں کرتے بلکہ پہچاننے کی بات کرتے ہیں۔ کسی چیز کا جاننا بس اس کا سرسری طور پر علم ہونے کے برابر ہے لیکن اس چیز کا پہچاننا اس شئے کی پوری معرفت ہوئے بغیر ممکن نہیں ہے اور یہی معرفت اصل شئے ہے۔ ہم اس دُنیا میں بے شمار چیزوں کو جانتے ہیں لیکن ہمیں معرفت بہت تھوڑی چیزوں کی ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے لیکن اس کے رموز و اسرار کو سمجھنا بغیر پوری معرفت کے ممکن نہیں ہے اور صرف یہ جان لینا کہ یہ کتاب خدا ہے ہدایت کے لئے کافی نہیں۔ روزانہ کی مثالوں میں اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک گھڑی جو ہر وقت ہمارے ساتھ رہتی ہے اور شب و روز ہماری کلائی کی زینت بنی رہتی ہے اور برسہا برس تک ہم اس سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں بہت کم لمحات ایسے

آتے ہیں جب وہ ہمارے ہاتھ سے جدا ہوتی ہے لیکن اتنی قربت کے باوجود بھی جب وہ کبھی خراب ہوتی ہے تو ہمیں (اگر ہم گھڑی بنانا نہیں جانتے) اسے گھڑی ساز کے پاس لے جانا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اتنا قریب سے جاننے کے باوجود ہمیں اس کی پوری معرفت نہیں ہے۔ اسی طرح اس سلسلے میں بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہت زیادہ قریب رہنے کے باوجود بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کو کسی کی پوری پوری معرفت حاصل ہو جائے۔ یہ حدیث جس وقت ارشاد فرمائی گئی اس وقت عمل رسالتؐ پر نگاہ ڈالیے اور رسول اکرمؐ کی وہ نزاکت عمل پر غور کیجیے تو حسینؑ کے بارے میں سیرت پیغمبرؐ کا ایک غیر معمولی رخ سامنے آتا ہے۔ بعد نماز خطبہ ارشاد فرمانا مسلمانوں کی تبلیغ اور ہدایت کے لئے ایک اہم ترین دینی فریضہ تھا۔ اسی خطبہ اور موعظہ کے ذریعہ ان لوگوں کو جو اسلام کو جانتے تھے انہیں اسلام کی بھرپور معرفت کرائی جا رہی تھی اور اسلام کو پہنچوایا جا رہا تھا اور یہی وہ محل تھا جب حسینؑ کے اوپر رسولؐ کی نگاہ پڑی خطبہ منقطع کیا اور حسینؑ کو گرنے سے بچا کر گود میں اٹھا لیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ "یہ میرا فرزند حسینؑ ہے اسے اچھی طرح پہچان لو" اس واقعہ سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:۔

۱۔ جو مسلمان اس مسجد میں تھے وہ اسلام کو بھی جانتے تھے اور حسینؑ کو بھی جانتے تھے۔ رسولؐ اسلام کو مزید پہنچوانے کے لئے

خطبہ اور موعظہ فرما رہے تھے یہاں تک کہ حسینؑ سامنے آ گئے۔ اب حسینؑ کو پہچنوانے لگے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ خطبہ اور موعظہ سے اہم بات یہ تھی کہ حسینؑ کو زمین پر گرنے سے بچایا جائے اور اب اس کی معرفت کرائی جائے جو اسلام کا ایک جزو ہے۔

۲۔ خطبہ بہرحال، ایک عبادت کی منزل تھی اسے اس وقت تک ترک نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک اس سے اہم منزل عبادت نہ آ جائے۔

۳۔ اسلام کے تعارف میں اور حسینؑ کے تعارف میں کوئی ایسا ربط باہمی تھا کہ الفاظ اور شخصیت دونوں کو رسولؐ نے یکجا کر دیا۔

۴۔ پورے کا پورا عمل رسالت جزیات بشریت کے تقاضہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ فریضہ رسالت کی انجام دہی کے لئے تھا۔ ورنہ خطبہ منقطع کر کے حسینؑ کو گود میں کبھی نہ لیا جاتا اگر حسینؑ صرف فرزند ہوتے۔

سرور عالمؐ یہ جانتے تھے کہ اہلبیتؑ کو محض رسمی طور پر جان لینا مسلمانوں کے لئے کافی نہ ہوگا اسی لئے وہ بار بار عنوان بدل بدل کر لہجہ بدل بدل کر انداز بدل بدل کر اہلبیتؑ کو پہچنوانا چاہتے تھے انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ جاننا اسلام کی منزل ہے اور پہچاننا ایمان کی منزل ہے۔ وہ مسلمانوں کو صرف مسلم نہیں دیکھنا چاہتے تھے بلکہ مومن بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ اسلام لانا آسان تھا لیکن اس اسلام کی تصدیق دل سے کر کے ایمان کی منزل میں داخل ہونا دشوار تھا

اسی طرح اہلبیتؑ کو جاننا تو بہت آسان تھا لیکن ان کو پہچاننا اور بعد رسولؐ ان کے نقش قدم پر چلنا آسان نہ تھا۔ اپنی اولاد کے بارے میں پہچنوانے کی اتنی کاوش اس کے پہلے کسی اور نبی کے کردار میں نہیں ملتی۔ لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ گذشتہ انبیاءؑ نے اپنی اولاد کو پہچنواتے ہیں اتنا وقت صرف کیا جتنا ہمارے رسولؐ نے کیا۔ ظاہر ہے کہ ان انبیاءؑ کے دل محبت اولاد سے خالی نہ تھے لیکن ہر نبی کا عمل اس کے منصب کی بنیاد پر ہوا کرتا ہے اس کے جذبات کی بنیاد پر نہیں ہوا کرتا۔ گذشتہ انبیاءؑ یہ بات جانتے تھے کہ انکے بعد سلسلۂ نبوت باقی رہے گا اور کوئی نمائندے اپنا فریضۂ تبلیغ ادا کرتے رہیں گے۔ لیکن رسول اکرمؐ اپنے بعد کے ہونے والے ہادی اور رہنما کا تعارف اس لیئے اور بھی ضروری سمجھتے تھے کہ ان کے بعد سے سلسلۂ نبوت ختم ہو رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہلبیتؑ رسولؐ کو آپ پہچنوانے کے سلسلے میں ہر اس جگہ نمایاں نظر آتے تھے جہاں کوئی دین کی بات ہوتی تھی خواہ وہ حالت نماز میں حسینؑ پشت رسولؐ پر نظر آئیں خواہ موعظہ کی حالت میں آغوش رسولؐ میں خواہ نماز عید کیلئے جاتے ہوئے دوش رسولؐ پر نظر آئیں خواہ وہ خانۂ کعبہ میں بت شکنی کی منزل ہو جہاں علیؑ دوش رسولؐ پر ہوں۔ خواہ وہ غدیر خم کا میدان ہو خواہ وہ مباہلہ کی منزل ہو لیکن ہر جگہ کوئی نہ کوئی دینی فریضہ ضرور ادا کیا جاتا رہا ہو گا۔ اس طرح سے مسلمانوں کے عقائد اور نظریات کی اصلاح اس حدیث رسولؐ کی روشنی میں معلوم ہوتی ہے کہ حسنؑ اور حسینؑ کو

محض رسمی طور پر جان لینا کافی نہیں ہے بلکہ ان کو اچھی طرح پہچاننا بھی ضروری ہے۔ اور بغیر اس معرفت کے نجات کی توقع ایک موہوم امید سے زیادہ نہیں ہے۔

نویں حدیث

ہادی عالم سرور انبیاءؐ نے ارشاد فرمایا جس کا لفظی ترجمہ یا مفہوم اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ "میرے دونوں فرزند امامؑ ہیں خواہ وہ کھڑے ہوں۔ یا بیٹھے ہوں"۔

امامت ایک دینی منصب ہے جو خداوند عالم کی جانب سے اپنے خاص بندوں کو ملتا ہے۔ کبھی کبھی یہ منصب نبوت کے درجہ عالیہ پر فائز ہونے کے بعد ایک خصوصی شرف کی حیثیت سے نبی کو ملتا ہے۔ جس طرح جناب ابراہیمؑ کو منجانب خالق عطا کیا گیا تھا۔ اور کبھی بلا منصب نبوت صاحبان رشد و ہدایت کو ملتا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں ارشاد ختم الانبیاءؐ سے ظاہر ہوتا ہے۔

اگرچہ مسلمانوں نے خصوصیات اہلبیتؑ میں عمومیت پیدا کرنے کے لئے تمام دینی القاب کو غلط افراد پر تقسیم کیا ہے۔ ہر فاسق و فاجر بادشاہ کو امیر المومنین کہا گیا ہے۔ ہر ظالم و جابر حاکم کو خداوند ظل اللہ کہا گیا ہے اور صاحب اقتدار کو خلیفہ رسول کا لقب دیا گیا۔ اسی طرح امام کے لقب کو بھی بے محل استعمال کرتے ہیں کسی طرح کے تکلف سے کام نہ لیا گیا۔ لیکن قرآن سے بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ امامت

ایک ایسا منصب ہے جو کسی ظالم کو کسی حال میں نہ ملے گا جب جناب ابراہیمؑ کو امامت کا منصب ملا اور انھوں نے اپنی ذریت کے لیے بھی اس منصب کا سوال کیا تو ارشاد خالق یہی تھا کہ کسی ظالم کو میرا منصب نہیں ملے گا۔ ارشاد خالق یہ نہ تھا کہ نبی کے سوا کسی دوسرے کو یہ منصب نہ ملے گا۔ ظالم کی جو تعریف لغت میں ہے اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ ظلم سے سوا معصوم کے کوئی دوسرا شخص بچ ہی نہیں سکتا ہے۔ اس لئے امامت منجانب خالق اسی کو مل سکتی ہے جو عملاً معصوم ہو۔ سرور عالمؐ نے اس حدیث میں جس امامت کا تذکرہ کیا ہے وہ اسی طرح کی امامت ہے جہاں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ حدیث کے صرف الفاظ ہی کو اگر لیجیے اور اسکی معنویت پر کوئی غور نہ کیا جائے جب بھی یہ بات ثابت ہے کہ یہ اپنے صاحبزادوں کی عظمت عمل کی طرف اشارہ ہے۔ کھڑے ہونا یا بیٹھنا اگر یہ عمل ہے تو وہ بھی ظلم کے حدود میں آتا ہے اور ظالم امام نہیں ہو سکتا اور رسول اکرمؐ ہر حال میں امام کہہ رہے ہیں۔ یہ تو ظاہری معنی ہیں۔ اب آیئے حتی الامکان اس کے رموز و اسرار پر غور کرنے کی کوشش کریں۔

۱۔ امامت ایک ایسا عہدہ ہے جس پر خالق خود فائز کرتا ہے۔ جناب ابراہیمؑ کے لیئے بھی ارشاد ہوا تھا کہ ہم نے تم کو انسانوں کا امام بنا دیا۔

۲۔ امامت کے لیے نبوت ضروری نہیں ہے۔ ورنہ خالق جواب جناب ابراہیمؑ میں یہ ارشاد فرماتا کہ میرا منصب امامت غیر نبی کو مل ہی

نہیں سکتا۔

۳۔ امامت ظالم کو نہیں مل سکتی۔ اور ظلم کے معنی ہیں کہ کسی شئے کو بے محل رکھنا۔ اور یہ اتنی معمولی غلطی ہے کہ روزانہ کی زندگی میں برابر واقع ہوتی رہتی ہے اس لئے عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ امام خواہ نبی نہ ہو لیکن معصوم ضرور ہو۔ تاکہ سہو و نسیان تک سے محفوظ رہے اور زندگی کے کسی لمحہ میں امکان ظلم باقی نہ رہے۔

۴۔ سرور عالمؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ میرے دونوں فرزند امامؑ ہیں۔ حالانکہ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ "حسنؑ اور حسینؑ امام ہیں"! جیسا کہ جوانان اہل جنتؑ کی حدیث میں موجود ہے۔ لیکن اس حدیث میں فرزند کہہ کر نہ صرف یہ کہ قرآن کے سورۂ کوثر کی تائید کی گئی ہے بلکہ ان تمام باطل نظریات و تصورات کی تردید بھی کی گئی ہے جو بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد میں اولاد رسولؐ کے بارے میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

۵۔ حضور ختم الانبیاءؐ اپنے فرزندوں کی امامت کا اعلان کر رہے ہیں۔ جو ایک خالص دینی منصب ہے لیکن جو صفت بیان فرما رہے ہیں وہ روزانہ کی مجلسی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی اٹھنا، بیٹھنا کھانا پینا چلنا پھرنا۔ یہ سب روزانہ کی زندگی کے تقاضے ہیں ان کا بظاہر امامت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ حضورؐ اپنے فرزندوں کی صرف روزانہ ہی کی زندگی کو نہیں بیان فرما رہے ہیں بلکہ ان نواسوں کی عظمت کردار کا تعارف ہے۔ رسول اکرمؐ مسلمانوں کے

ذہن کو مشاہدہ کی راہ سے غیب کی منزل تک لانا چاہتے ہیں۔ کھڑے ہونے اور بیٹھنے سے مراد پیغمبرؐ ایک فرزند کی صلح ہے اور دوسرے فرزند کی جنگ ہے۔ مسلمانوں کو زبان رسالتؐ سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر ایک صلح کر کے بیٹھ جائے تب بھی اس پر اعتراض نہ کرنا بلکہ امام ہی سمجھنا۔ دوسرا فرزند اگر جنگ کرنے کے لئے میدان میں آ کر کھڑا ہو جائے جب بھی دونوں کے عمل میں ظاہری فرق کے باوجود اس کو بھی حق ہی پر سمجھنا۔ دونوں امام ہیں اور ان سے غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے

تاریخ اسلام کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ صلح کے مواقع پر بھی ہمیشہ یہ اعتراضات کئے گئے ہیں۔ صلح حدیبیہ سے لے کر صلح امام حسنؑ تک یہی صورت حال نمایاں ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت خواہ جنگ میں ثبات قدم کا مظاہرہ نہ کر سکے لیکن وہ صلح پر ہمیشہ معترض رہی ہے۔ حد یہ ہے کہ حیات پیغمبرؐ میں حکم پیغمبرؐ تک نظر انداز کیا گیا اور جب حیات پیغمبرؐ میں پیغمبرؐ کی بات بے اثر ہو کر رہی تو بعد پیغمبرؐ کا اندازہ لگانا کچھ دشوار نہیں ہے۔ حدیبیہ سے ملتی جلتی صورت حال امام حسنؑ کی بھی ہے۔ صلح کر لینے کے نتیجہ میں وہاں پیغمبرؐ کی رسالت پر شبہ ظاہر کیا جا رہا تھا یہاں امام زمانہؑ کو یا مذل المومنین کہہ کر مخاطب کیا جا رہا تھا۔ حالانکہ حدیبیہ اور صلح امام حسنؑ کے شرائط میں بڑا فرق ہے۔ حدیبیہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کفار اپنی شرائط پر صلح منوا رہے ہیں اور یہاں معاویہ سادہ کاغذ پیش کر کے امام حسنؑ کے شرائط پر صلح کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود صلح پر ہر جگہ اعتراض ہوتا رہا۔

حالانکہ جو صحیح معنوں میں شجاع تھے وہ صلح پر کہیں معترض نہ تھے۔ لیکن جو کردار کے غازی نہ تھے وہ ہر جگہ صلح پر اعتراض کر کے گفتار کے غازی بننا چاہتے تھے اور میدان جنگ کے خلا کو صلح کے ماحول میں اپنے نمائشی جوش و جذبات کا مظاہرہ کر کے پُر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس حدیث میں رسولؐ اپنے نواسوںؑ کی صلح کو حق قرار دے رہے ہیں۔ اور ان کی جنگ کو بھی۔ اب مسلمان اپنے عقائد و نظریات میں ایسے جو بھی سمجھے یہ تو اسے حق حاصل ہی ہے لیکن رسولؐ کیا سمجھ رہے ہیں اسے سمجھ کر کچھ سمجھنا چاہیئے ورنہ رسول اکرمؐ کی رائے سے انحراف ہوگا۔ اور یہ بات اعراض عن الحق و اعتراض علی الحق کے مترادف ہوگی جس کے نتائج کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

دسویں حدیث

ہادی عالم ختم الانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "جنت تین آدمیوں کی مشتاق ہے سلمانؓ، مقدادؓ و ابوذرؓ"

ہر مسلمان کی فطری خواہش ہے کہ وہ جنت میں جائے۔ عقیدہ معاد کا تصور جس جس شکل میں جن جن مذاہب میں ہے۔ وہاں جنت جیسی کسی نہ کسی آرام گاہ کا کوئی نہ کوئی تصور ضرور موجود ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے تو عقیدہ معاد اصول دین میں شامل ہے۔ ہر اچھا مسلمان نیک اعمال کا صلہ یہاں سے زیادہ آخرت کے لئے اٹھا

رکھنا چاہتا ہے۔ اور آخرت میں حسن عمل کے نتیجہ میں جنت ہی ملے گی۔ جنت کے پر از کیف و نشاط تذکرے قرآن و احادیث میں برابر ملتے ہیں اور جہاں کہیں بھی قرآن میں جنت کا وعدہ کیا گیا ہے وہاں ایمان کے بعد عمل صالح کی قید ضرور ہے۔ بغیر عمل صالح کے حصول جنت کا تصور ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ جنت کے بھی مختلف مدارج ہیں بہتر اعمال کے نتیجہ میں بہتر مدارج مقدر کئے جائیں گے۔ مسلمانوں کے ہر دور میں یعنی عہد سعادت میں بھی جنت کا تصور بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اور ہر مسلمان کی بہت بڑی خواہش یہی رہتی تھی کہ مرنے کے بعد اسے جنت میں جگہ ملے۔ یہ بات تو قرآن سے ثابت ہے کہ عمل صالح کی عدم موجودگی میں اولاد پیغمبرؐ اہلبیت پیغمبرؐ کے زمرہ سے خارج کی گئی اور عمل صالح کی تکمیل کے بعد سلمان عجمی اہلبیتؑ کے زمرہ میں شامل ہوکر سلمان محمدی کہلائے۔ اس سے یہ بات تو ثابت ہی ہوتی ہے کہ عمل صالح ہر مسلمان کو دنیا میں اہلبیت رسولؐ سے قریب کرسکتا ہے اور آخرت میں جنت سے۔ اسی لئے جوانان اہل جنت کے سرداروںؑ کو اہلبیتؑ میں سے قرار دیا گیا۔ اس کے سوا اور کوئی دوسری وجہ عقلاً ممکن ہی نہیں۔ جنت اور اہلبیتؑ میں ایک ایسا رابطہ ہے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

مذکورہ بالا حدیث میں تین صحابہ رسولؐ ایسے ہیں جن کی جنت مشتاق ہے۔ اب جن کی جنت مشتاق ہے ان کی عظمت کردار اور بلندی کا اندازہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اس حدیث کے ماسوا ایک اور حدیث بہت

مشہور ہے۔ جس میں حضورؐ نے دس افراد کو بشارت جنت دی ہے ان دس افراد میں بہ مصلحت یا حالات کے جبر کی بنا پر حضرت علیؑ کا نام بھی احتیاطاً شامل کر دیا گیا ہے تاکہ جعلی اور وضعی نہ معلوم ہو۔ باقی وہ لوگ ہیں جو یا تو خلفاء اسلام ہیں یا خلیفہ گر رہے یا جنگ جمل و قادسیہ میں بہت نمایاں رہے ہیں لیکن ان دونوں حدیثوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسلامی تاریخ کی نمایاں شخصیتیں وہ ہیں جن کو بشارت جنت دینے پر اکتفا کی گئی ہے۔ جو کسی بھی مسلمان کو کسی بھی دور میں اپنے حسن عمل کی بنیاد مل سکتی ہے۔ اور دوسری حدیث میں نسبتاً کم نمایاں اور گمنام اصحاب رسولؐ ایسے ہیں جن کی جنت خود مشتاق ہے۔ بشارت جنت والی حدیث میں حضرت علیؑ کو شامل کیا گیا ہے جن کے فرزند جوانان اہل جنت کے سردار ہیں جناب سلمانؓ و مقدادؓ و ابوذرؓ بعد رسولؐ نہ تو آسمان اسلام کے مہر و ماہ ہوئے۔ نہ ان دس اصحابہ کے مقابلہ میں ان کو شہرت و عظمت حاصل ہوئی۔ بلکہ جناب ابوذرؓ تو تیسری خلافت میں معتوب قرار دیئے گئے اور انھیں ربذہ کی طرف جلاوطن کیا گیا۔ ان کی صاف گوئی ان کے لئے مصیبت بن گئی خلافت کی ترتیب کو مسلمانوں نے ترتیب فضیلت کا پابند بنایا ہے اور اس طرح منصب حکومت کو کردار پر ترجیح دی گئی ہے۔ اس لئے دُنیاوی حیثیت سے جناب ابوذرؓ کا کیا وقار ہو سکتا تھا۔ انھیں دنیا والوں نے نظرانداز کیا اور تاریخ نے بھی بھلا دیا۔ لیکن ہمیں اس سے بحث نہیں کہ دُنیا والوں نے ان اصحابؓ کو کیا سمجھا، ہمیں صرف اس سے بحث ہے کہ رسولِ خدا نے

ان لوگوں کو کیا سمجھا اور ان کی نگاہ مبارک میں ان کا کیا مرتبہ تھا۔
نگاہ رسولؐ میں ان کی جو عزت تھی وہ مذکورہ بالا حدیث سے ثابت ہے۔
اور اب اگر بشارت جنت والی حدیث صحیح مان لی جائے تو بہت سے
اشکال پیدا ہوتے ہیں جس پر غور کرنا ضروری ہے۔

۱۔ جناب سلمانؓ و مقدادؓ و ابوذرؓ سرور عالمؐ کی وفات کے بعد
حضرت علیؑ کو اپنا رہبر و پیشوا امام سمجھتے رہے۔ دنیا نے اپنی نگاہیں
جدھر بھی موڑ لیں مگر ان کی نگاہیں ہر حال میں حضرت علیؑ کے اوپر
تھیں، بلا کسی اختلاف یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے رسولؐ
کے بعد سب سے افضل حضرت علیؑ کو جانا اور سمجھا۔ اور یہ ایک حقیقت بھی
تھی۔ تو اب جو رہنما اور امام تھا اس کو صرف جنت کی بشارت اور جو
لوگ ماموم اور پیرو تھے ان کے لئے یہ ارشاد کہ جنت ان کی مشتاق ہے
یہ چیز عقلاً ناممکن ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا بشارت جنت والی حدیث
کے بارے میں ہر عقیدہ اور نظریہ غلط ہے۔

۲۔ حیات رسالت میں ۲۳ سالہ خدمات کا حاصل کیا صرف دس
آدمیوں کو بشارت جنت کے سوا اور کچھ نہیں، اس لئے کہ اگر کوئی گیارھواں
بھی ایسا ہوتا تو رسول اکرمؐ اس کو بھی اس فہرست میں شامل فرماتے۔
پھر اس حدیث کا کیا حشر ہو گا کہ سب صحابی عادل ہیں۔ اس لئے کہ جب
انفرادی طور پر اعمال ایسے نہیں ہیں کہ جنت میں کوئی نہ جا سکے تو وہ کسی
دوسرے کی ہدایت کیا کر سکے گا۔ اور یہ بات پوری ملت اسلامیہ کے لئے
ایک لمحہ فکریہ ہے کہ اگر حیات رسالتؐ تک کا حاصل بس دس آدمیوں کو

بشارت جنت سے زیادہ نہیں ہے تو جب رسولؐ کی زندگی ذہنوں کو اس سے زیادہ متاثر نہ کرسکی تو بعد رسولؐ دس آدمیوں کے بارے میں یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ جنتی ہوں گے۔

اب تک میں نے پچھلے اوراق میں جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ احادیث رسولؐ مسلمانوں کے عقائد اور نظریات کی اصلاح کا ذریعہ ہیں اور ان احادیث سے نہ صرف یہ کہ تاریخی غلطیوں کی اصلاح بھی ہوسکتی ہے بلکہ ہمیں مستقبل کی تاریخ کا بھی علم ہوسکتا ہے۔ لیکن اس حدیث سے جس میں جناب سلمانؓ و مقدادؓ و ابوذرؓ کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان کی جنت مشتاق ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صحیح احادیث رسولؐ کے ذریعہ عقل کی رہنمائی میں ہمیں غلط احادیث کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اصلی چیز دل کے سامنے اگر ان چیزوں کا ملمّع بھی رکھ دیا جائے تو یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں ہوتا کہ اس میں کون اصلی ہے کون ملمّع ہے۔ مذکورہ بالا حدیث بظاہر صرف تین اصحاب رسولؐ کے بارے میں انکی بلندی کردار اور عظمت کی نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن جب اس پر نگاہ غائر ڈالی جائے تو یہ حدیث جمہور مسلمین میں رائج اور مشہور بہت سی حدیثوں کے چہرے کی نقاب کشائی بھی کرتی ہے اور اس سے یہ اندازہ لگانا کچھ دشوار نہیں ہے کہ کیا صحیح ہے کیا غلط ہے۔

چنانچہ اس حدیث سے عشرہ مبشرہ والی حدیث بے حد مجروح ہوتی ہے خواہ وہ جمہور مسلمین کا نقطۂ نظر ہو خواہ وہ شیعی نقطۂ نظر ہو۔

اس لئے کہ جمہور مسلمین کے نقطۂ نظر سے عشرہ مبشرہ والی حدیث میں جو افراد شامل ہیں ان کی اکثریت کے بارے میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جناب سلمانؓ و مقدادؓ و ابوذرؓ سے بہتر ہیں۔ تو اب جو افضل ہیں انھیں صرف بشارت جنت اور جو غیر افضل ہیں انکی جنت مشتاق یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

شیعی نقطۂ نظر سے عشرہ مبشرہ والی حدیث تو غلط ہے ہی لیکن اس حدیث کی روشنی میں اس کی غلطی مزید نمایاں ہوتی ہے اس لئے کہ عشرہ مبشرہ والی حدیث میں حضرت علیؑ ہیں جو ہر حال میں ان تینوں بزرگ صحابیوں سے افضل ہیں۔ حضرت علیؑ کے فرزندوں کے بارے میں یہ ارشاد رسولؐ موجود ہے کہ "حسنؑ و حسینؑ جوانان اہل جنت کے سردار ہیں اور ان کے باپ ان سے افضل ہیں" تو جب حضرت علیؑ جو انان اہل جنت کے سرداروں سے بھی افضل ہیں تو انھیں بشارت جنت دینے پر رسولؐ اکتفا کریں اور جناب سلمانؓ و مقدادؓ و ابوذرؓ کے لئے یہ ارشاد فرمائیں کہ "جنت ان کی مشتاق ہے" جنت تو علیؑ کے ادنیٰ غلاموں تک کو ملے گی۔ علیؑ کا کیا سوال ہے۔ رسول اکرمؐ علیؑ کے بارے میں اتنا کمزور بات نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح یہ حدیث "اصحابی کلھم عدول" والی حدیث کی پُرزور تردید کرتی ہے اسی طرح ہمیں صحیح احادیث سے غلط حدیثوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

میں نے اس پورے مقالہ میں روایت اور تاریخ سے بہت کم

کام لیا ہے صرف احادیث اور مشہور ترین واقعات کا سہارا لیا ہے سارا زور عقل انسانی پر دیا ہے، اور عقل سے نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیئے کہ اگر عقل نہیں ہے تو دین کا عرفان نہیں ہوسکتا عقل ہی سب کچھ ہے۔ عہد سعادت میں بھی ہیں ایسے واقعات معلوم ہیں جب آپ خطبہ ارشاد فرماتے تھے اور اصحاب سنتے تھے اور باہر آکر آپس میں یہ کہتے تھے کہ یہ ابھی کیا کیا فرما رہے تھے۔ بہت سے صحابہ قرآن کے اہم الفاظ و معنی و مطالب کو تا حیات نہ سمجھ سکے۔ اس لیئے مذہب کا صحیح عرفان بغیر عقل کے ممکن نہیں ہے۔ ایک وہ شخص جو میرے موقف سے اتفاق نہیں رکھنا چاہتا میں اسے مجبور نہیں کرسکتا لیکن ان لوگوں سے جو عقل کو اہمیت دیتے ہیں ان سے ضرور اپیل کرتا ہوں کہ آیئے واقعات کو عقل کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔

میں نے جتنی احادیث زیر نظر مقالہ میں پیش کی ہیں وہ صحیح ضرور ہیں خواہ بہت زیادہ مشہور نہ ہوں۔ بہت زیادہ مشہور احادیث پر میں نے اس لئے نہیں تبصرہ کیا کہ ان پر اس کے پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ماسوا اس کے میں مناظرہ کو اپنا موضوع بنانے کی صلاحیت اپنے میں نہیں پاتا ہوں۔ نہ میں نے مناظرہ کی غرض سے یہ سطریں لکھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے لوگ میرے خیالات سے اتفاق نہیں کریں گے۔ میں نے کچھ احادیث کے ذریعہ تاریخی غلطیوں کی اصلاح کی کوشش کی ہے لیکن اس میں کہاں تک

کامیاب ہوا ہوں۔ اس کے بارے میں خود کیا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار تو کیا ہی نہیں جا سکتا کہ اگر حدیث رسولؐ بالکل صحیح ہے اور تاریخ اس سے ٹکراتی ہے تو حدیث صحیح ہے تاریخ غلط ہے اور کچھ احادیث کے ذریعہ عقائد و نظریات کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ عقائد و نظریات کی اصلاح کا ذریعہ قرآن اور حدیث کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر صحیح حدیث ہے تو اس کے ذریعہ غلط عقائد کی اصلاح نہ کرنا گمراہی کو دعوت دینے کے مرادف ہو گا۔

آخری حدیث میں (دسویں حدیث) میں نے عشرہ مبشرہ والی حدیث کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس جگہ حدیث کے مقابل میں حدیث ہے۔ اب کوئی بھی وہ معترض جو میری بات کو نہیں تسلیم کرنا چاہتا وہ یہ کہہ کر میرے استدلال کو رد کر سکتا ہے چونکہ عشرہ مبشرہ والی حدیث صحیح ہے اور یہ حدیث اسکے معارض ہے اس لئے یہ حدیث ہی غلط ہے۔ اس کے میرے پاس دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ علم رجال کے ذریعہ راویوں کی چھان بین کی جائے اور دیکھا جائے کہ حدیث کے راوی زیادہ معتبر ہیں اور اسے زیادہ قابل اعتبار سمجھا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے یہ صاحبان علم کی منزل ہے۔ دوسرا طریقہ اس کے جواب کا تاریخی اور عقلی ہے جسے میں سطور ذیل میں پیش کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس جواب کی سچائی سے انکار ممکن نہیں ہو گا۔

جناب سلمانؓ و مقدادؓ و ابوذرؓ کی شخصیتیں کردار ساز تو ضرور ہیں لیکن تاریخ ساز نہیں ہیں۔ یہ گوشہ نشین افراد تھے جن سے مورخ کو دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ مورخ کی نگاہ تخت حکومت پر ہوتی ہے۔ صاحب تخت و تاج افراد کی زندگی کے جزئیات تک کو تاریخ محفوظ رکھتی ہے۔ وہاں سے ہٹ کر مورخ کی نگاہ میدان کارزار میں آکر رکتی ہے۔ وہ چلتی ہوئی تلواروں اور چمکتے ہوئے نیزوں اور تڑپتے ہوئے لاشوں کو تو ضرور دیکھتا ہے لیکن محراب عبادت میں جھکی ہوئی پیشانیوں پر اس کی نگاہ نہیں پڑتی۔ یہ تینوں افراد نہ تو تلوار کے دھنی تھے نہ ان کے پاس تخت حکومت تھا۔ نہ خلیفہ تھے نہ خلیفہ گر تھے نہ درباروں میں ان کو کوئی رسوخ تھا بلکہ جناب ابوذرؓ تو معتوب بارگاہ خلافت رہے ہیں۔ ان کی حق گوئی کی برداشت حکومت لاہی نہیں سکتی تھی۔ خود اہلبیت رسولؐ میں وہی افراد تاریخ میں نمایاں جگہ پا سکے جن کے ساتھ حکومت رہی یا کوئی میدان کارزار رہا۔ اسی لئے حضرت علیؑ کی زندگی کردار ساز بھی ہے اور تاریخ ساز بھی۔ صلح امام حسنؑ تک مورخ امام حسنؑ کے ساتھ ساتھ ہے پھر اس کی نگاہ شام کی طرف مڑ جاتی ہے۔ امام حسینؑ کے حالات میں پچپن سال میں مورخ نے اتنا نہیں لکھا جتنا کہ چند دن میں کربلا میں لکھا گیا۔ تو جب اہلبیت رسولؐ کو نظرانداز کیا جا سکتا تھا تو ان کے طرفدار اصحاب رسولؐ کو نہ تو مورخ یاد رکھ سکتا تھا نہ محدث۔ یہ تو اس صورت میں جب حالات میں کوئی

پیچیدگی نہ ہوتی اور وہ معمول کے مطابق ہوتے۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ احادیث رسولؐ کے بارے میں شروع ہی سے اختلاف پیدا ہو گئے، اور عہد بنی امیہؔ میں احادیث کے گڑھنے کی باقاعدہ فیکٹریاں قائم کر دی گئیں اور ان تمام احادیث کے بارے میں جو اہلبیت رسولؐ کی شان میں تھیں کوئی نہ کوئی ترمیم کرنے کی کوشش کی گئی یا ان میں جو خصوصیت تھی ان میں عمومیت پیدا کی گئی یا اس کے مقابل کوئی حدیث وضع کی گئی یا صحیح احادیث کے قبل و بعد ایسے الحاقی نقرے لگا دیے گئے جس سے حقیقت چھپ جائے یا اس شکل میں باقی نہ رہے جو حدیث کا اصلی منشار تھا۔ تو جب اہلبیت رسولؐ تک کو اس سلسلہ میں معاف نہ کیا گیا تو دوست داران اہلبیتؑ کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ بنی امیہؔ کا عہد اقتدار تاریخ اسلام کا تاریک ترین دور ہے۔ انھوں نے اولاد رسولؐ اور احادیث رسولؐ کو پامال کرنے کی ہر امکانی کوشش سے کام لیا۔ اور قرآن کے ساتھ جو سلوک کیے وہ بھی اظہر من الشمس ہیں۔ اسے نیزوں پر بلند کیا گیا اس پر تیر باران کیا گیا۔ اور اس کے معانی و مطالب کی غلط تشریح کی گئی۔ غرضیکہ اسلام کی ہدایت کے جتنے طریقے بعد رسولؐ باقی رہ گئے تھے ہر ایک کو تباہ و برباد کرنے کی ہر ممکن سعی سے کام لیا گیا۔ آج امیر شام معاویہ کے ابتدائی کاموں کی جب فہرست تیار کی جاتی ہے تو وہ کچھ اس طرح شروع کی جاتی ہے۔

انھیں کے عہد حکومت میں پہلی بار مسلمانوں کو جمعہ کی نماز چہارشنبہ کے دن پڑھنے کا موقع ملا۔

انھیں کے دور حکومت میں نبیذ (جَو کی شراب) پہلی بار حلال کی گئی اسلام میں پہلا سر جو نیزہ پر چڑھایا گیا وہ عمر بن حمق خزاعی صحابی رسولؐ کا تھا اور یہ عہد امیر شام کا واقعہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ دوست کسی کے بھی نہ تھے۔ انھوں نے اپنے محسنین یعنی حضرت ابوبکر وعمر تک کو نہ معاف کیا۔ جب جناب محمد بن ابوبکر نے انھیں وہ خط لکھا جس میں انھوں نے ان کو امیرالمومنین حضرت علیؑ کی اطاعت کا مشورہ دیا تھا تو اس کا جو جواب انھوں نے دیا ہے۔ اس جواب میں انھوں نے جس طرح حضرت ابوبکر وحضرت عمر کو رسوا کرنے کی کوشش کی ہے وہ انھیں کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔ یہ جواب اگرچہ ایک حقیقت کا اعتراف تھا لیکن وہ اپنے محسنین کو رسوا کرنے کے بجائے کوئی مہمل جواب بھی تو دے سکتے تھے جیسا کہ وہ اس کے پہلے وبعد اکثر دیا کرتے تھے۔ شہادت جناب عمارؓ کی جو توجیہ انھوں نے بیان کی تھی اس سے زیادہ مہمل جواب اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی طرح کا وہ کوئی جواب محمد ابن ابی بکرؓ کو بھی دے سکتے تھے یا خاموش رہتے۔ لیکن اب وہ اقتدار کے مالک ہوتے جا رہے تھے اب انھیں کسی کی پروا نہ تھی۔ ماضی کو وہ کہاں تک یاد رکھ سکتے تھے۔ پھر اس کے بعد یزید کی ولیعہدی کے سلسلہ میں انھوں نے خلفاء ثلاثہ کی اولادوں کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز کیا بلکہ ان کے ساتھ جو ناروا سلوک کیے وہ تاریخ کے طالبعلموں سے

آج بھی مخفی نہیں ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ کے ساتھ انھوں نے جو کچھ کیا اس پر پردہ ڈالنے کی کوششوں کے باوجود آج بھی چھپایا نہ جا سکا۔ تو ایسی صورت میں علیؑ اور اولاد علیؑ اور اصحاب علیؑ کو وہ کیا معاف کرتے۔ ان کا تحمل بھی ان ذوات مقدسہ کے بارے میں ختم ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی صلاحیت برداشت بھی کھو دیتے تھے۔ چونکہ خلفاء ثلاثہ کی اولادوں میں کوئی اتنا صاحب صلاحیت نمایاں نہ ہوا کہ حق کی راہ میں وہ اپنے کو قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتا۔ اسلئے امیر شام اور خلفاء شام نے ان سے تعرض نہ کیا۔ اگر ان میں بھی کوئی نمایاں ہوتا تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی معاف نہ کیا جاتا۔ محمد ابن ابی بکرؓ کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ بہیمت کا بدترین مظاہرہ بھی ہے اور خلفاء کی اولاد سے بنی امیہ کے طرز عمل کا صحیح ثبوت بھی ہے۔

اولاد خلفاء ثلاثہ میں ان کے علاوہ ہمیں کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جس نے حکومت شام کے خلاف آواز اٹھائی ہو۔ اسکے بعد بھی امیر شام نے خفیہ حربوں سے کام لے کر خلفاء ثلاثہ کی اولادوں کو ختم کیا تاکہ یزید کے لئے راہ ہموار ہونے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ تو اب جو راہ حق میں ان کے مدمقابل تھے ان کو وہ کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ پوری بنی امیہ کی تاریخ پڑھ ڈالیے۔ عمر بن عبدالعزیز کے پہلے جمع احادیث کی کوئی کوشش نہیں ملتی ہے۔ پھر سناٹا ہے۔ وسعت سلطنت کی ہر امکانی کوشش کی گئی نظم حکومت کو مستحکم کیا گیا۔ لیکن فقہ و سنت کے لئے کچھ نہ کیا گیا۔ برائے نام ایک فرقہ کا نام

اہلسنت والجماعت رکھ دیا گیا لیکن اس فرقہ کے لئے کوئی کام نہیں کیا گیا
اس مختصر کوشش کے بعد جب فقہ جعفری کی ترتیب ہوچکی اور امام جعفر
صادقؑ نے بنی عباس اور بنی امیہ کے اختلافات کے ماحول میں ذرا
سا موقع پاکر فقہ محمدیؐ کی بنیاد رکھ دی تو انہیں کے شاگرد امام
ابو حنیفہ کو فقہ اہلسنت کے جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اب چونکہ
فقہ جعفری کے معارض ایک دوسری فقہ کی بنیاد رکھی جارہی تھی اس
لئے اپنی انفرادیت کی بقا کے لئے قرآن کی واضح ہدایتوں کو نظر انداز
کیا گیا۔ مثلاً قرآن نے وضو اور تیمم کے بارے میں واضح الفاظ میں
طریقے بتائے ہیں اور فقہ جعفری بالکل اسی کے مطابق ہے لیکن فقہ
حنفی اس سے بالکل مختلف ہے۔ بہت دور کی ضمیر کو پیروں کے
دھونے کے لئے صحیح سمجھنا اور قریب کی ضمیر کو نظر انداز کرنا دور کی
کوڑی لانے کی بات تو ہوسکتی ہے لیکن اس کا عقل سلیم سے کوئی
تعلق نہیں جبکہ تیمم کا طریقہ قریب کی ضمیر کو صحیح بتا رہا ہے۔ اسی
طرح اور بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن چونکہ بنی امیہ اور
بنی عباس کا کوئی مذہب نہ تھا وہ صرف اپنے اقتدار کے بھوکے تھے
اور وہ دین کے محافظوں کے دشمن تھے اس لئے بس حکومت کی بقا
کے لئے ایک برائے نام اسلام کی ضرورت تھی۔ بنی عباس جو انتقام
خون امام حسینؑ کا نام لے کر اقتدار کی منزل تک پہونچے انہوں نے
بنی فاطمہؑ کے لئے اپنے جذبہ عناد کو بنی امیہ سے زیادہ ظاہر کیا اور
انہوں نے اپنے مظالم سے بنی امیہ کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

ان کے محلات کی دیواروں میں استحکام اولادِ رسولؐ کے استخوانوں سے ہوتا تھا اور ان دیواروں پر رنگینی و گلکاری بنی فاطمہؑ کے خون سے کی جاتی تھی۔ محبانِ اہلبیتؑ کی زندگیاں قیدخانوں میں یا دار و رسن کے سپرد ہو جایا کرتی تھیں۔ بہلول مجنوں نہ تھے لیکن جن باتوں کو وہ کہنا چاہتے تھے انھیں دانا بن کر نہیں کہہ سکتے تھے انھوں نے مجنوں بن کر حق کی تبلیغ کے فرائض ادا کئے۔ مامون رشید کا اپنے عہد کے علماء سے حضرت علیؑ کی افضلیت کے بارے میں مناظرہ اور اس کے بعد اعلان اس کی ذہانت کی دلیل ہے لیکن اس سے اس کی سیاست کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ایک طرف تو وہ علیؑ کے برسرِ حق ہونے کا اعلان بھی کرتا ہے۔ پھر فرزندِ رسولؐ امام رضاؑ کو ولی عہد و داماد بھی بناتا ہے دوسری طرف وہ امامؑ کو زہر بھی دیتا ہے۔ کتنی دور سے وہ اپنی سیاست کو بروئے کار لا رہا ہے۔ وہ بخیالِ خود دنیا کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ مجھے جس سے اتنی عقیدت ہے میں اسے زہر تھوڑے ہی دے سکتا ہوں لیکن دنیا میں محاسن چھپ جاتے ہیں معائب نہیں چھپتے اور کبھی نہ کبھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بنی امیہ و بنی عباس کے اقتدار کو تقریباً چھ سو سال گذر گئے۔ اتنے مخالف ماحول میں اہلبیتِ رسولؐ اور دوستدارانِ اہلبیتِ رسولؐ کے محاسن اور فضائل کا باقی رہنا حیرت انگیز بات نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ پورا پس منظر تھا جسے میں نے سطورِ بالا میں درج کیا ہے۔ اس میں احادیث وضع کی گئیں دین و شریعت میں

ترمیم کی گئی۔ اہلبیت رسولؐ کا جو طریقہ دین کے بارے میں تھا اس سے مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ اگر وہ نماز میں بسم اللہ زور سے پڑھتے تھے تو ان کے مخالفین نے آہستہ پڑھنا شروع کیا وغیرہ وغیرہ حکومت کی پشت پناہی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ ایسے ماحول میں ہمیں اگر اہلبیت رسولؐ کے شان میں کوئی بھی حدیث نہ ملتی تو تعجب نہ ہوتا۔ لیکن احسان فراموشی ہوگی اگر ان علمائے اہلسنت کا بھی شکریہ نہ ادا کیا جائے جنھوں نے فضائل اہلبیتؑ کی بقا کے لئے اپنی جان تک کی بازی لگا دی۔ امام نسائی کو شام والوں نے صرف حقائق نسائی کی تصنیف پر اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ اسی طرح اور بہت سے علماء تقریباً ہر صدی میں ایسے گزرے ہیں جنھوں نے فضائل اہلبیتؑ کے احیاء کے لئے اپنی کاوش قلم سے کام لیا۔ چنانچہ بارھویں صدی ہجری میں فرنگی محل کے ایک سنی عالم ملا محمد مبین فرنگی محلی نے اپنی مشہور کتاب لکھی جو ائمہ اثنا عشر کے حالات میں ہے اور جس کا نام انھوں نے وسیلۃ النجاۃ رکھا گیا رھویں صدی ہجری میں دوسرے عالم علامہ عبد القادر حنبلی شافعی نے اپنی مشہور کتاب آل رسولؐ کے بارے میں لکھی جس کا نام انھوں نے ذخیرۃ المآل رکھا۔ دسویں صدی ہجری میں علامہ شمس الدین دولت آبادی نے اہلبیتؑ کے فضائل میں ایک کتاب لکھی جس کا نام انھوں نے مفتاح النجاۃ رکھا۔ غالباً نویں صدی ہجری میں علامہ کمال الدین محمد بن طلحہ شافعی نے ایک کتاب آل رسولؐ کے مناقب میں

تحریر کی جس کا نام مطالب السئول فی مناقب آل رسول رکھا۔ اسی طرح اور بھی لوگ ہوں گے جن کا نام مجھے نہیں معلوم لیکن مذکورہ بالا کتابوں کے مصنفین کے جذبات اور تصور کا اندازہ ان کتابوں کے ناموں ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔ وسیلۃ النجاۃ۔ ذخیرۃ المآل جیسے نام رکھنا یہ بتاتا ہے کہ حکومتیں بعد رسولؐ جن ذوات کو مٹانے کے لئے اپنی ساری کوششیں صرف کر رہی تھیں۔ انھیں ذوات کے بارے میں اسی فرقہ کے علماء اسلام کیا عقیدہ اور نظریہ رکھتے تھے۔ اس طرح انتہائی مخالف ماحول کے باوجود فضائل اہلبیتؑ کچھ باقی رہ گئے اس لئے اب اگر کوئی حدیث دوست داران اہلبیتؑ اور خود اہلبیتؑ رسولؐ کی شان میں اور دوسری حدیث صاحبان تخت وتاج کے بارے میں ہو اور دونوں ایک دوسرے سے معارض ہوں تو پہلی حدیث کو صحیح سمجھنا صحیح ہوگا اس لئے کہ سلمانؓ مقدادؓ وابوذرؓ کی شان میں حدیث نہیں وضع کی گئی بلکہ ان لوگوں کے لئے وضع کی گئی جو صاحبان اقتدار تھے۔ ان کے عہد میں بھی لیکن ان کے بعد دشمنان اہلبیتؑ نے جو برسراقتدار آچکے تھے مراتب اہلبیتؑ کو کم کرنے کے لئے ان میں مساوات وعمومیت پیدا کرنے کے لئے کچھ ایسی شخصیتوں کا انتخاب کر لیا جن کو عہد رسالتؐ میں اہلبیت رسولؐ کے مدمقابل بخیال خود لایا جا سکتا تھا۔ اس طرح ان کی شان میں احادیث وضع کی گئیں۔ وہ لوگ جن کی زندگیاں قیدخانوں کے لئے وقف تھیں اور جن کے گلے رسن و دار کے لئے تھے

اور جن کے ہاتھ ہتھکڑیوں کے لئے اور پیر بیڑیوں کے لئے بنے تھے ان کی شان میں یا ان کے چاہنے والوں کی شان میں کیا کوئی حدیث وضع کرے گا۔ اور کیوں کوئی ان کی غلط مدح کرے گا۔

یہ کہنا کہ شیعوں نے تقیہ کر کے سنی بن کر کتابیں لکھ دیں اور وہ کتابیں حنفی مورخین کی کتابوں کی حیثیت سے رائج ہو گئیں، خود فریبی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ صاحبان اقتدار کے عہد میں شیعہ غیر شیعہ بنتا ہے کتابیں لکھتا اس عہد کے علماء اور اکابر اس کی کتاب کی تعریفیں کرتے ہیں اسے امام اہلسنت قرار دیتے ہیں۔ اور اس طرح صدیاں گزر جاتی ہیں۔ جن لوگوں نے اس شخص کو خود دیکھا تھا یا جو لوگ اس کے عہد کے قریب تھے انھیں اس پر کوئی شبہہ نہ تھا۔ اب اس دور کے لوگ اسے شیعہ کہنے لگے محض اس لئے کہ اس نے اپنی کتاب میں کچھ ایسے حقائق کو درج کر دیا تھا جو اس کے عقیدہ سے میل نہیں کھاتے تھے لیکن یہ حقائق تو اس زمانہ کے لوگوں کی نگاہ سے بھی گذرے ہوں گے اور اس کے بعد لوگوں نے بھی اسے دیکھا ہو گا تو اس وقت کے عہد کے لوگوں کو اس کے عقیدہ اور مذہب پر کیوں نہ شبہہ ہوا۔ اگر اس وقت ہوتا اور اگر بات صحیح ہوتی تو یقیناً ہونا چاہیئے تھا تو یہ معلوم کرنا بھی بہت آسان ہوتا کہ یہ شخص حنفی ہے یا غیر حنفی ہے۔ اس کا خاندان معلوم ہو سکتا تھا اس کی پہلی زندگی معلوم ہو سکتی تھی۔ اس کے ماحول اور عقیدہ کے بارے میں ہر بات عیاں ہو سکتی تھی

اس لئے کہ حکومت طاقت دولت ہر شئے سے کام لے کر حقائق کا پتہ لگایا جا سکتا تھا۔ وہ باتیں تو ان لوگوں کے عقیدہ اور مذہب کے بھی خلاف تھیں جنھوں نے ان علماء کو بھی اپنے مذہب کا امام اور گراں قدر علما مانا تھا۔ جبکہ خود شیعوں نے اس مصنف کو کوئی بھی اہمیت نہ دی اور اپنی مذہبی زندگی میں ان کے لئے کوئی مقام نہ سمجھا۔ مگر اس مصنف کے بارے میں اس وقت اور مدتوں تک کچھ نہ کہا جانا بلکہ اس کی عزت کرنا اور اب اسے شیعہ کہنا یہ عصبیت یا جہل کے سوا کچھ نہیں۔ اس وقت تک اہلبیتؑ کے فضائل جزو دین تھے۔ اب حنفیت کی جگہ عصبیت لے رہی ہے اور حنفی مذہب دم توڑ رہا ہے اس لئے حنفی علماء اسلام کو شیعہ کہا جانے لگا ہے جس طرح محبت اہلبیتؑ کو رفض کہا گیا جس پر امام شافعی نے جھلا کر یہ کہا تھا کہ اگر محبت اہلبیتؑ رفض ہے تو دونوں عالم گواہ رہیں کہ میں سب سے بڑا رافضی ہوں۔ اسی طرح اب ان علماء اہلسنت کو بھی جنھوں نے اپنی کتابوں میں اہلبیتؑ کے فضائل کو جگہ دی ہے انھیں شیعہ کہا جانے لگا۔ حالانکہ میں اپنی کم علمی کے باوجود یہ بات پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہزاروں سنی مذہب کی کتابوں میں سے چھانٹ کر اگر چند ہی ایک کتابیں خالص علماء اہلسنت کی تسلیم کی جائیں بلکہ صرف صحاح ستہ ہی کو سنی علماء کی کتاب سمجھا جائے جب بھی ان چند کتابوں میں سے فضائل اہلبیتؑ اور حقائق اتنے مل سکتے ہیں جو کسی سمجھنے والے

ضمیر کی رہنمائی کے لئے کافی ہو سکتے ہیں۔ صحیح بخاری جسے امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں سے چھان بین کرکے ترتیب دیا اور اب جس میں صرف سات ہزار دو سو پچاس حدیثیں ہیں اور جس میں فضائل اہلبیت کا اخفاء اتنا واضح ہے کہ علماء اہلسنت تک نے اس پر اعتراض کیا ہے حد یہ ہے کہ علامہ بخاری نے حدیث کی کتاب ہونے کے باوجود حضرت ابوبکر کی شب ہجرت اور صبح ہجرت کی تمام سیرت کے جزئیات تک بیان کیا لیکن حضرت علی کا شب ہجرت بستر رسول پر سونا نہ لکھ سکے۔ صرف اسی کتاب کو اگر اہلسنت کی کتاب سمجھا جائے جب بھی اتنے اخفار کے باوجود اسی ایک کتاب کے ذریعہ بہت سے ان حقائق کا پتہ لگایا جا سکتا ہے جس سے شیعی نقطۂ کی تصدیق ہو سکے۔ جیسا کہ میں نے پہلی حدیث جناب سیدہ کے بارے میں اسی کتاب سے لی ہے لیکن ان تمام حقائق کے باوجود جو لوگ میرے موقف کو نہیں تسلیم کرنا چاہتے وہ ہرگز نہیں تسلیم کریں گے اسی لئے میں نے شروع ہی میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر سرور عالم کی وفات کے بعد احادیث رسول کی ترتیب عہد خلافت راشدہ میں کر لی گئی ہوتی تو آج سنت رسول کے بارے میں یہ اختلافات نہ ہوتے لیکن ذمہ داروں نے سنت رسول سے اپنے عہد میں کام تو لیا لیکن اس کی ترتیب و تدوین نہ کی۔ عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں تھوڑی سی کوشش احادیث رسول کی ترتیب کی گئی

لیکن صرف چار سال کے قلیل عرصہ میں بہت تھوڑا سا کام ہو سکا اور پھر اس کے بعد مکمل خاموشی، یہاں تک کہ پہلی صدی اور دوسری صدی ہجری گزر گئی۔ اس پورے عہد میں سنت رسولؐ کو برباد کرنے کی کوشش تو ضرور ہوئی لیکن اس کو بچانے کی کوئی سعی نہیں کی گئی۔ یہ ہے خلافت و حکومت کا وہ کارنامہ جس پر اسلام ہمیشہ گریاں رہے گا۔ اب صرف یہی چارہ ہے کہ ان احادیث میں سے صحیح احادیث کا انتخاب کر کے اسے عقل سلیم کی روشنی میں دیکھا جائے اور اسی سے راہ ہدایت کا تعین کیا جائے۔ یہی کوشش میں نے فی الحال ان دس مذکورہ بالا حدیثوں کے ذریعہ کی ہے اور فی الحال دفعیں عشرہ مبارکہ پر اکتفا کر کے آپ لوگوں کی تخفیف زحمت کرتا ہوں۔ فقط والسلام علیٰ من تبع الہدیٰ

ناچیز

علی حیدر زیدی

ڈاک خانہ و مقام سکندر پور
ضلع فیض آباد۔ یوپی

۴ / جون ۱۹۷۰ء
مطابق
۲۸ / ربیع الاول ۱۳۹۰ھ